

ایک دن پروفیسر گوتم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اتر کر اپنے مکان کی برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ میا برج والے نواب صاحب آپ سے ملنے آئے تھے، بڑی دیر آپ کی راہ دیکھا کیے، ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ نیلمبر اٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آ کر جلدی سے چاروں اور دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جلدانی کا انگرکھا پہنے جریب ٹیکتا سڑک کے کنارے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جالیا۔

”اٹھ میاں نیلمبر صاحب“ بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ ”ہمارا خیال تھا آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔“

”کیوں نواب صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یوں بھی برس گزر جاتے ہیں ملنا نہیں ہو پاتا، اب آئیے چل کر دو گھڑی اندر بیٹھیے۔ میری نواسی سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے، آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔“

نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

”اچھا میاں۔“ نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم کو دیکھ لیا، تمہارے بچوں کو دیکھ لوں، پھر جانے زندہ لوٹنا نصیب ہو

”نہ ہو۔“

”کیوں۔ کہاں کا قصد ہے۔ لکھنؤ۔؟“

”کربلائے معلیٰ جا رہا ہوں۔ خدا وہیں یہ مٹی عزیز کرے، یہاں اب کیا رکھا ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے مشہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ ملازم چائے لے کر آیا۔ ڈرائنگ روم ہمعصر و کٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر ان گنت تصویریں تھیں۔ مناظر اور فوٹو گراف، موتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔ فرن اور پام کے پودے پیتل کے گملوں میں رکھے تھے۔ برابر کے کمرے میں پیانو بج رہا تھا۔ پیانو کی آواز یکلخت نیلمبر دت کو بڑی اداس معلوم ہوئی، انہوں نے آواز دی: ”نیلما بیٹی، باجہ بند کرو اور یہاں آؤ، دیکھو تمہارے مینا برج والے چاچا آئے ہیں۔“

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی، اس نے جھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

”یہ میری نواسی ہے نواب صاحب، اسکول ہی میں رہتی ہے۔“ وہ دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کر کے گود میں بچہ کھلانے کے بجائے اسکول میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجاتی تھی۔

نواب کمسن نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے درتپے سے باہر نظر ڈالی۔ کلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگمگا اٹھی تھیں۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ نیلمبر دت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے دونوں کے پاس مشترکہ موضوع گفتگو کوئی نہیں

تھا سوائے ماضی کے، مگر ماضی کی یاد کو نیلمبر دت کہاں تک گھسیٹ سکتے تھے، ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمین کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضع داری نبھانے کے لیے دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملتے تھے، جب لکھنؤ اجڑا اور کلکتے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی آباد ہوئی، میاں برج میں دوسرا لکھنؤ بسایا گیا۔ اس وقت نواب کمین نے، جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آ گئے تھے، نیلمبر دت کو ملاقات کے لیے بلوایا، وہ اس سے کلکتے کا مشہور اخبار نویس بن چکا تھا۔ اس نے اب تک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہموسماج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلمبر ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا، جب راجہ سریندر موہن ٹیگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار کلکتے میں جمع ہونا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلمبر نے نواب کمین کو یاد رکھا اور نئی سنگیت کی محفلوں میں مدعو کرتا رہا۔

اب کمروں میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جن میں مینڈک ٹراتے تھے مکان کی بالائی منزل پر نیلمبر بابو کے بیٹے منورجن دت کے یونیورسٹی کے ساتھی تھیٹروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے۔ منورجن کے دوست مائیکل مدھوسودن نے ایک نیا ڈرامہ لکھا تھا، اس سے وہ سب اس کی پریکٹس میں جئے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ کیمپل میڈیکل اسکول میں ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہارمونیم بجا رہا تھا۔ منورجن تو رولتا کی نئی انگریزی نظم پڑھ رہا تھا۔ ہارمونیم کے سر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا، دوسرا عہد، یہ ۱۸۷۱ء تھا۔ دنیا بوڑھی ہو چکی تھی۔ نواب کمال رضا کی دنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے مگر ان کی دنیا اب جوان ہو رہی تھی، یکنخت نواب کمسن کو احساس ہوا کہ اس نئی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مضحکہ خیز نظر آئے۔

”نواب صاحب! منورنجن لکھنؤ کے کیتنگ کالج میں قانون کا لیکچرار ہو کر جا رہا ہے۔“ گوتم نیلمبر دت کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کرے سے آ رہی تھی، وہ چونک پڑے۔ ”اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ سے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”جائیں، سدھاریں، ان کو امام ضامن کی ضامنی میں۔۔۔ دیا۔“ پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر مٹیابرج لوٹ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمسن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائینگ روم میں ٹہلتے رہے، انہوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی، مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل، قانون کے رسالے، کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قراردادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انہوں نے پایا تھا۔

مسائل کا حل انہوں نے پایا تھا؟ نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی، باہر سڑکوں پر لیپ مدھم مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ دفعتاً عروس البلا دملکت

ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا، وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کیلے اور پام کے پتے ساکن کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتادم ٹانگوں میں سمیٹے سو رہا تھا، اگر ان کو آواگون میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتا کسی کی دکھی روح ہے، وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ اوپر منورنجن کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپبل میڈیکل اسکول کا لڑکا ابھی تک درتے میں بیٹھا تھا، وہ بھی ہارمونیم کے پردوں پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ منورنجن کے کمرے سے جو زینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھا کوئی تو رولتا کی نئی انگریزی انظم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چاند اب دت ہاؤس کے عین اوپر آچکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تو رولتا کی انظم پر سر دھن رہا تھا:

محبت اور روشنی اور نغمے کو تمہاری تلاش ہے۔

روشنی قمر مزی آسمانوں پر موجود ہے

نغمے لارک گارہا ہے

محبت میرے دل میں ہے

ایک دوسرے سے جدا

ہم فطرت کے مقصد کو کھورہے ہیں

اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لیے ہم کیوں کوشاں ہیں

میری محبت تمہاری روح کے لیے تخلیق کی گئی ہے

تمہارا حسن میری آنکھوں کے لیے

اب جاگ اٹھو

میں منتظر ہوں اور روتی ہوں

تم کہاں ہو

اس دھرتی پر ایک بے آسرا،

پیار، بد صورت اور حقیر

بچے کی طرح میں پیدا ہوئی

پیدائشی بد قسمت لڑکی۔۔۔۔

ہر ایک نے مجھے ٹھکرا دیا ہے

پھر میرے ہونٹوں سے ایک نالہ بلند ہوا:

خدا یا۔۔۔!

اور خدا نے جواب دیا:

گائے جا۔۔۔۔ بے چاری لڑکی۔۔۔ گائے جا۔۔۔

نیلمبر دت مہبوت اس انظم کو سنتے رہے۔ انہوں نے آواز پہچانی، یہ ان کے

بیٹے کی آواز تھی۔ منورجن اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی

کے فلسفے اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے، جو اگلے ہفتے

کیتنگ کالج کا پروفیسر ہو کر پردیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔ مبارک ہیں وہ لوگ، انہوں نے اپنے آپ سے کہا، جو

محبت کر سکے۔ خواہ اس میں انہیں ناکامی ہی ہوئی ہو، پھر انہوں نے چاند کو دیکھا جو

تیرتا تیرتا دت ہاؤس کے عین مقابل میں آچکا تھا۔ اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔ چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں، وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابوالمنصور کمال رضا بہادر جب گارڈن ریج پہنچے، جہاں میٹا برج میں ان کا مکان تھا، تو اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ان کو خیال آیا: کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے۔ انسان مر جاتا ہے، پھر کبھی اس دنیا کو نہیں دیکھ پاتا جیسے شاہ زمن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی، ان سب کو مرتے نواب کمسن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ لوگ، جو اودھ پوری کے راجہ تھے، یہ سب موت آئی تو پٹ سے ختم ہو گئے اور بے چارے سلطان عالم واجد علی۔ پڑوس کی رادھا منزل میں اندر سبھا منعقد کروا کے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں، ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تخت شاہی ہو یا غریب الوطنی، انتہائی مسرت ہو یا شدید رنج و غم، موت آ کر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے، جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوتا ہوگا۔ فشار قبر اور منکر نکیر اور --- اور --- یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمسن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔ انہوں نے تکیے پر سے سر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو آواز دینا چاہی۔ انہوں نے پلنگ سے اٹھنا چاہا مگر پیچھے کو گر گئے۔

کیونکہ کربلائے معلیٰ کا سفر کرنے کے بجائے نواب کمال رضا سفر آخرت

اختیار کر چکے تھے۔

۳۴

نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطان عالم تک نو حکمرانوں نے اودھ پوری پر راج کیا۔ سلطان عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔ صفدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، جو دلی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شاندار سلطنت تھی، جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چہارم سے زیادہ جاہ و جلال والے تھے۔ سلیمن صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا اس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دیپ مالا چشم زدن میں بجھ گئی۔ ہیولاک جیتا۔ سلطان عالم ہارا۔ لکھنؤ کی اندراپوری اجڑ گئی۔ نوٹنکی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں سبز پری کا ناچ، عیش باغ کے میلے، محرم اور رام لیا کے ہنگامے۔ دل کش محل اب سنسان پڑا ہے۔ ہیلی گارڈ کو توپوں نے اڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دکانیں ہیں۔ امین آباد میں کالج اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تار جھنجھٹاتے ہیں۔ ایوڈھیا کے رام چندر کی گدی لٹ چکی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمرو عیار کا ظلم تھا، آخری ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیولوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفیسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے

تھے۔ ریل گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی اور وہ فنڈ پر بیٹھ کر باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، وہ آج سے اڑتالیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے، وہ شاہی کالکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کالکھنؤ ہے۔ یہاں دھومی بیگ کو تو ال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے جو سعادت علی خاں کی نور بخش کوٹھی میں براجتا ہے، پچارے سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب پینکس ہاؤس کہلاتی ہے، اس میں کمشنر رہتا ہے۔ قیصر باغ میں کیننگ کالج ہے۔ جس میں کلمتہ کا منور نجم دت قانون پر لیکچر دیتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاس چوک، معالی خاں کی سرائے، پانا نالہ، چو پٹیاں، چو لکھی، گولہ گنج، بارود خانہ، سعادت گنج، ڈالی گنج، حسین گنج۔ ساری جگہیں وہیں ہیں۔ مکان، انسان مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے، غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو پھانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیاجب سے پردیس سدھارے اب تو ان کے لیے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے، یہ اودھ پوری ہے۔ یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن باس ملا تھا۔

فنڈ اسٹیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پر انگو چھاپیٹ کرنیل مبر دت کو دیکھا: ”بابو صاحب، پیچھے سائیکس بیٹھا ہے، اسے اوپر بلا لوں۔ بڑھو ہے گر کر مر جائے گا۔“

”ہاں بلا لو۔“ انہوں نے جواب دیا۔ پیچھے سے ایک بوڑھا کو دکر کوچ بکس پر آ گیا۔ فنڈ پھر روانہ ہوئی۔

”بابو صاحب کلکتے سے تشریف لاوت ہیں۔“

”ہاں“

”ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں، یہاں اب جی نہیں لگتا۔“ نوجوان نے کہا۔

”کوہے“ بوڑھے سائیس نے نوجوان کے کان کے قریب منہ لے جا کر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”کلکتے کے بابو۔۔۔“ نوجوان نے، جس کا نام شمشو تھا، چلا کر کہا۔

”کلمتہ۔۔۔؟“ بوڑھے نے، جس کا نام گنگا دین تھا اور جو اونچا سنتا تھا، غیر یقینی انداز میں دہرایا اور پھر مڑ کر دھندلی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

”ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آوا؟“ شمشو نے کہا۔

”بابو صاحب“ گنگا دین نے مڑ کر بڑی لجاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ ”ہم کا بھی کلکتے پٹھائے دیو۔“

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا: ”بابو صاحب تمہاری بولی نہیں سمجھتے، اردو میں اپنا مطلب بیان کرو۔“

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا: ”کھداوند، ہم کو کلکتے پٹھا دیجئے، وہاں ہمارے بادشاہ رہت ہن۔“

نوجوان ہنس پڑا: ”حضور بابا کی بات پر دھیان مت دیجئے۔ یہ جو مسافر ریل سے اترتا ہے اس سے یہی بات کہتے ہیں، میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچا دو۔ پوچھو، ہمارے بادشاہ خود جو کھم میں ہیں، اوپر سے یہ بھی پہنچ

جائیں۔ جیسے بس ان ہی کی کسر ہے۔“

نیلمبر دت خاموش رہے۔ فٹن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”سرکار پہلے بھی نکھلو تشریف لائے ہیں۔“ نو جوان نے پوچھا۔

”ہیں؟“ نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا، ”ہاں“

”کب؟“

”بہت زمانہ گزرا جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے وقت میں۔“

”بابا۔“ کوچوان نے پھر چلا کر بوڑھے سائیکس کے کان میں کہا، ”بابو صاحب تمرے گاجی الدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔“

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا: ”بابا کہا کرت ہیں کہ گاجی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔ اس سے پہلے شکرم ہانکتے تھے مگر کہتے ہیں کہ محل میں پہنچ کر انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔ سارے بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر نوکری کی ہے، سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔“

”کھداوند“ گنگا دین نے کہا، ”سلطان عالم کو آپ نے دیکھا ہے؟ کیسے ہیں؟ خیریت سے ہیں؟“ پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔ مدتوں وہ محض عقل کے پجاری رہے تھے، اب آن کر انہوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔ فٹن اب امین آباد کے چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا: ”ارے سامنے سے ہٹتی نہیں بوڑھیا، کاہے اپنی جان

کی لاگو ہوت۔“ اس نے باگیں کھینچ کر فن روک لی۔ ایک ضعیفہ دلانی میں لپٹی ہوئی سامنے آ گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا کر میکا کی انداز میں اپنے فقرے دہرانے شروع کر دیے: جناب امیر کا صدقہ، خدا تمہیں سوا غم حسین کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فن کے کشنوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے: لکھنؤ کیا بوڑھوں کا شہر ہے؟ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جو باقی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شام اودھ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیر فی اسی طرح آنکھیں بند کیے کھڑی دہراتی رہی: خدا سوا غم حسین کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک ٹکا خالی ایک ٹکا۔

نیلمبر دت چونک پڑے۔

یہ آواز جانی پہچانی تھی، یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی۔ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے تھے تھے لگائے تھے۔

انہوں نے ہڑبڑا کر عینک درست کی اور فن سے باہر جھانکا مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیر فی کھڑی تھی جس نے اودھے رنگ کی بوسیدہ دلانی اوڑھ رکھی تھی۔

”اے کچھ مت دیجئے گا خداوند۔“ شمبھو نے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مودبانہ انداز میں کہا، ”اے کوکین کی لت ہے، جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے نیک بخت۔“

نیلمبر دت نے اپنے ریشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر فقیرنی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید براق دھوتی پہنے اگر نی شال میں لپٹا ناگ پہ ناگ رکھے فٹن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا۔۔۔

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لمحہ کے لیے اسے بڑی ہوئی، یہ کیسا دیا لورکس ہے جو نکا مانگو تو چاندی کا روپیہ دیتا ہے۔ سکے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دہرانا شروع کر دیا: سرکار، غریب پرور۔۔۔ آپ کو پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں غدر کی ماری ہوں، بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب کوئی دوروٹی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو۔۔۔ شمبھو نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ فٹن آگے بڑھ گئی۔ شمبھو، جس کی دنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، ہنس کر کہنے لگا:

”بڑھیا کی باتیں۔ درو جے پر ہاتھی جھومتا تھا، یہ گردی کا یا ر لوگوں کو اچھا بہانہ

مل گیا ہے جس سے سنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یوں طرم جنگ تھا، فلانا تھا،
 ڈھمکا تھا۔ بابا ہی کو دیکھ لیجئے، بابو صاحب، گردی سے پہلے بادشاہ کے خاص
 چوہدار تھے۔ اب سائیکسی کرتے ہیں۔“ وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہار خیال
 کرتا ہوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا۔

چمپا نے روپے کو شام کے اندھیرے میں کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ
 آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی جہاں ایک زمین دوز دکان میں کوکین
 فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگڑیے اور مدکیے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

اندھیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ جس وقت فنن امین
 آباد کے چوراہے سے آگے بڑھی۔ نیلمبر دت نے ایک بار پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ چمپا
 سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں
 الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال
 چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں، اس
 کی دلائی میں جا بجا پیوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر گوکھرو اور بنت کی رہ گئی تھی جس
 کے تار نکلے ہوئے تھے۔

انہوں نے فنن کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشالی کی امبا پالی کو دیکھ لیا تھا۔

گوتمی کے اس پار شاہ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو
 منورجن دت نے اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ فنن موتی محل کے
 پل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے

والی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔

اس رات جب منورجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں لیمپ گل کر دیے گئے تب نیلمبر دت برآمدے میں آ کر، جس کی سیڑھیاں ندی میں اترتی تھیں، بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیک چکی تھی، لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا، ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے کچھل پیریاں رقصاں تھیں۔ سامنے کچھ دور پر پل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چنڈی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سرخ آنکھوں والے بندر سو رہے تھے، یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے، لنگڑاتے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہان اودھ، سعادت علی خاں اور جان بیلی، نصیر الدین حیدر اور ان کا یورپین حجام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سرل ہاورڈ، ایشلے اور شنیلڈ۔ لارڈ میکالے اور بشپ ہیبر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا، جب زندہ تھے اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے، مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دنیا کا عروج و زوال گومتی نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون سا تماشہ دیکھنا باقی تھا۔ ندی رواں تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سو رہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت رواں تھا۔ وقت پتھر میں منجمد تھا۔ مرگھٹ میں

شعلے بلند ہو رہے تھے، آج کی رات جانے کون کون مرا ہوگا۔

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے، صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مرگھٹ۔۔۔ یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتیں ہیں۔۔۔ اور کالی۔۔۔ جو ذہن اور گویائی سے ماوراء ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ۔۔۔۔۔ جو سونیا کو پورن بناتی ہے۔ پورن۔۔۔ جو روشنی اور سکون ہے۔ کالی۔۔۔۔۔ جس کا لباس سماوی ہے، وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ مرگھٹ میں کالی ہشیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

ہشیو۔۔۔۔۔ جو سفید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے اور مایا اور خود پرستی کے عفریتوں کو تباہ کرتا ہے، وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماوراء ہے۔ کالی اس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

ہشیو۔۔۔۔۔ جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھویں میں کالی رقصاں ہے، وہ کالی ہے۔ تارا۔۔۔۔۔ دھوموتی، وہ شانت رس کا ناچ ناچ رہی ہے اور کائنات بے بے کے نعرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کو سستی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا،

انہوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صبح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انہوں نے جا کر مہری کو جگایا جو ایک طرف کوفرش پر چٹائی بچھائے سو رہی تھی۔ ”چاء کا پانی رکھ دیو۔ چھٹکی کا اسکول آج چھ بجے سے لگے۔“ مہری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بالوں کا جوڑا لپیٹتی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگمگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھے گی۔ بڑے صاحب اور بھین صاحب کے شیو کا پانی پیالیوں میں لگائے گی، پھر چاء کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دور کچی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چرخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوجا کے لیے ٹھا کر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھا کر دوارہ دوسری منزل پر مشرق کے رخ کی برجی میں تھا۔ کمرے میں جس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھلا تو اندر کے اندھیرے میں گوپی ناتھ ٹھا کر حسب معمول اپنی خالی خالی آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھتے نظر آئے، ان کی کیسری پوشاک پر جھونا گونا لگا تھا اور ان کے مکٹ میں مور کا ایک پر تھا جو ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بانسری اٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں

کھڑے تھے۔ ساکت، منجمد، لاتعلقی، ان کے چہرے پر بڑی بھیاںک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں مجھربھنھنا رہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری برجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

پرانی وضع کی مسہریاں اور تخت چاروں طرف بچے تھے۔ تلسی کا منتقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سرمنڈے مہنت کی تصویر آویزاں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری برجی، جو چھتر منزل کے رخ پر تھی، اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا، وہ مزے سے ہلکی دلائی تانے کھڑکی کے قریب سنا رہا تھا۔ قریب ٹیبل فین گھوں گھوں کر رہا تھا۔ برجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور بڑی ٹھندی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں۔ پلنگ کے نزدیک والی میز پر دیوان غالب رکھا تھا اور کبیر کی گرن تھا دلی اور ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پانیر اور لیڈر کے پرچے اور انگریزی کے ادبی رسالے جو کلکتے اور بمبئی سے نکلتے تھے اور وشوا بھارتی میگزین دیواروں پر نند لال بوس اور اورانیندرنا تھ یگور اور خستنگر اور ایل ایم سین اور روی ورمہ کے واٹر کلرز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیبی تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پرٹاٹیاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنسنے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نیلی جیل سے باہر نکل رہے

تھے، ایک تصویر کمانہرو کی تھی۔ آٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم آویزاں تھے۔ ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء۔ آل انڈیا مباحثوں میں جو ٹرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ۔ یونین کے عہدیداروں کی تصویریں، ہسٹری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر سدھانت، ڈاکٹر راؤ، مسٹری۔ جی۔ رائے ایک کونے میں آتشدان کے اوپر ایک گروپ تھا جواب بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ اس تصویر پر ۱۸۹۷ء لکھا تھا، یہ گروپ بھی کیننگ کالج کا تھا۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانہ طالب علمی کی تھی، اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی ٹوپی اور بند کالر کا کوٹ پہنے بڑی مستعدی سے فیکٹی آف آرٹ کے ڈین ڈاکٹر منورجن دت مرحوم کے پیچھے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر دت کی یگور کی ایسی یہ لمبی سفید داڑھی تھی (یہ دوسری بات ہے کہ ہر داڑھی والا بنگالی یگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر داڑھی والا انگریز کنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھٹری پر دونوں ہاتھ رکھے کیمرے کو بہت گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں ان گنت تصویریں آویزاں تھیں۔ کانگریس کے اجلاس میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنہ، مہاراشٹر، گوالیار اور الور کے استاد لوگ بڑے بڑے پکڑ باندھے بیٹھے تھے۔ چیمبر اوف پرنسز کے گروپ۔ نچلی منزل میں ڈرائنگ روم کے آتشدان کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دقیانوسی بوڑھا سبز گوٹ کا جامہ اور چنا ہوا پانچجامہ پہنے، سر پر مندریل اوڑھے منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز

مصور نے بنائی تھی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا: ”رائے زادہ بخش مہتاب چند“
 چند تصویریں پرانے وقتوں کی دہنوں کی تھیں اور ایسی پییاں جو اونچی ساڑھیاں
 باندھے، انگریزی جوتے پہنے، ایک ہاتھ میز پر رکھے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی
 موٹی کتابیں یا گلدان رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین برجیاں تھیں۔ تیسری برجی
 میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ساز رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سورج بخش
 صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناچ سیکھتی تھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لئے مرکز کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکینوں کے
 لئے مرکز کائنات ہوتا ہے)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں، دہنوں کے ڈولے آئے، برائیاں
 چڑھیں، بیٹیاں وداع ہوئیں، بڑے بڑے تہوار منائے گئے۔ رام نومی اور جنم
 اشٹی اور دیوالی اور شوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے۔ لڑائیاں جھگڑے ہوئے،
 لوگ ہنسے اور روئے، ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا
 رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی
 ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک
 کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے
 ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں
 چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے، کبھی کبھی لہریں اسے بہا لے جاتی
 ہیں، پھر اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقرب خاص اور اودھ کے

وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی، اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں براجمان تھے جو اوسط درجے کے بیرسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں، تینوں ابھی طالب علم تھے۔

بیرسٹر صاحب کا سارا وقت کانگریس کے چکر میں نکل جاتا یا وہ بیٹھ کر زمانہ فراغت میں اردو شاعری پر مضمون لکھتے، پھر پریکٹس کی طرف توجہ کون دے، مگر گھر کی زمینداری تھی اس لیے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کے جہیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کیمبرج بھیجنے کی سوچ میں تھے، جہاں انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سے وہ برساتی کے اوپر جو کھلی چھت تھی اس پر چھتر دانی لگائے پڑے سوتے تھے۔ بی بی کی کھڑ پڑ کی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک بری عادت تھی کہ صبح صبح اپنی کھڑاؤں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں، کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں، کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں، کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ اس کے بعد وہ پوچھا کرتی تھیں اور زور زور سے راناں پڑھتی تھیں۔

بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھند لکا چھایا تھا، مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد او دے رنگ کے کمرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناٹا تھا، پل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ ترلوچن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی۔ بسترے لیے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ ”اٹھو بیٹا جلدی کرو۔“

تمہرا اسکول آج سے سیرے کا ہوئے گوا۔۔۔“ جمنا مہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا، لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے اس نے تکیے کے نیچے سے کھڑی نکال کر دیکھی، پانچ بج گئے۔ ارے رام ارے۔ آج سے اسکول کھل رہا تھا، وہ پلنگ پر سے کود کر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہلی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی، وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔۔۔ کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔ جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج وائج کی چنداں پرواہ نہیں تھی، وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

برجی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی چپل گھسینٹا انیچیوں کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس ٹک کر کاہلی سے ندی کو دیکھنے لگا، جدھر پل تھا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تولیہ کاندھے پر ڈال کر بے سری آواز میں گاتا غسل خانے میں گھس گیا۔

”اسکول میں اپنی گویاں سے کہہ دینا شام کو آ کر بڑکی کے لہنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں۔“ گھر کی بی بی نے ٹھا کر دو ارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلکا نیلا ٹیونک پہنے، جس کی پیٹی سرخ رنگ کی تھی، کتابیں اٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ نیچے برساتی میں لامارٹینر کی بس نے ہارن بجایا۔ ”اچھا۔ اچھا کہہ دوں گی۔“ اس نے میٹرھیاں اترتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پور بی تھیں۔ شادی ہو کر لکھنؤ آئے ان کو پچیس سال گزر

چکے تھے مگر اپنے لب و لہجے پر انہوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سسرال کی ٹکسالی اردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا، وہ بڑی بیٹی کو بڑی کہتی تھیں، چھوٹی کو چھٹکی، جیٹھ بڑ کو کہلاتے تھے۔ ماں مہتاری، تیاں منٹی۔ بیرسٹر صاحب ان کو بمبئی، کلکتہ، کشمیر سب جگہ گھملائے تھے، ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جوان کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی لڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا، نیچے باغ کی سڑک پر اسکول کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ سب انگریز لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ہاتھ ہلایا: ”ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کالج سے لوٹ کر۔“

”اچھا“ بڑی لڑکی جواب دیا۔

بس پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد لڑکا سیٹی بجاتا نیچے اترا، برساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بڑے اسٹائل سے سائیکل کے ہینڈل میں اٹکائی اور بے فکری سے پیڈل چلاتا کچی سڑک پر آ کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنگ سرخ کی برجیاں دور دھندلکے میں نظر آرہی تھیں۔

سورج نکل آیا، اب دنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں، دکانیں، کالج، سرکاری دفاتر، اخبار کے پریس، ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر، کارخانے، جیل۔۔۔ خلقت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی، روشنیاں جگمگائیں۔ بازار، محلے، کوٹھیاں، سینما ہاؤس، کلب،

بال روم، محل سرائیں، جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی
آوازیں بلند ہوئیں، یہ چار پانچ نوعمر لڑکیاں برآمدے کے جنگلے پر بیٹھی اس طرح
ہنستی تھیں جیسے رنج سے نا آشنا ہیں۔ شاید وہ رنج سے نا آشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ ندی کے کنارے کنارے ڈوٹیوں میں
چراغ جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

۳۵

سورج جس سے جامنوں کے پیچھے پہنچا تب فٹن میرس کالج سے لوٹ کر اپنی
نئی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آ جاتی تھی، یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا
بعد کا ہوتا تھا۔ ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ
کہلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچے راستے
جاتے تھے، ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی بوٹ کلب، آرٹ اسکول اور ندوۃ
العلماء کی طرف جاتا تھا، دوسرا کچا راستہ کاٹھ کے پل کی سمت۔۔۔ یہاں سے
ندی کے کنارے کنارے چاند باغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔ یہ علاقہ ٹرانس گومتی
سول لائینز اور حیدر آباد کہلاتا تھا، یہاں بے شمار نئے سیمنٹ کے مکان تھے۔ بم
بہادر شاہ کا دو منزلہ محل، چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس اور
سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشا ط گنج کی بستی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ،

جس کا ایک سر ایونیورسٹی روڈ پر تھا۔ بل کھاتی اس علاقے سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابل جھوہرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پرسکون علاقہ تھا، کبھی کبھار کوئی موٹر نکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکایا لڑکی۔ مضافات یا ڈالی گنج کی طرف جانے والے ایکے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرنز کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہ نگر اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ۔ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور پیپر مل جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چریا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنارس باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا، جس کے پیچھے غازی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لامارٹینر کالج اور لامارٹینر روڈ ہرے بھرے کنجوں سے نکلتی دل کشا پیلس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے جس کے آگے وسیع سرسبز چھاؤنی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا اور امیر الدولہ پارک، اور شہر۔۔۔ اور جھاؤ لال کا پل اور پھر سڑکیں نحاس اور چوک کی طرف جاتی تھیں جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال، شاہ مینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ، مچھی بھون اور امام باڑہ حسین آباد، وہیں اکبری دروازہ تھا اور گول دروازہ۔ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔۔۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوٹھی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے

کنارے موتی محل میں امپریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا، یہ بڑا وضع دار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں، نو دو لٹے پن کا اظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمبھرتا اور ٹھیراؤ کے ساتھ گزرنا سیکھا تھا۔

اس اطمینان اور آسائش کے ساتھ فٹن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچتی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سائیکلوں کا جھوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فٹن بائیں ہاتھ والی کچی سڑک پر اتر آتی، جہاں راستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے وقتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔ گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھامزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ ”بیٹا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلے گا۔؟“ وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سن رہی ہوں۔ (طلعت نے کہا) داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا، کون کردار زیادہ اہم ہیں، قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا، کلائمیکس کہاں تھی۔ ہیروئن کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہونا چاہیے تھا۔ ہیرو کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی کمال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کر وہ یہ سب طے کرے گا۔ کمال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا، پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ ’ہاں چلیں گے‘ میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فٹن آہستہ آہستہ کچی سڑک پر رواں رہتی، یہاں ہوکا

”بیٹا۔۔۔ نرملا بیٹیا کے یہاں نہیں چلئے گا؟“ گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے

بیٹھے کاہلی سے پوچھتا۔

اور پھر فن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو جاتی۔

”یہ لو بھین تمہارا آمد نامہ دے گئے ہیں۔“ لاج برساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔۔۔ بھین یعنی شکر سو یو استوا یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔

نرملہ برجی میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔ ”اے۔۔۔ ذرا آ کر جھپ تال تو بجا دینا۔“

وہ برجی کے کسی دوارے میں منہ نکال کر کہتی۔

ان کی اماں ٹھا کر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسری برجی میں سے آواز دیتیں:

”اری باؤلیو۔۔۔ پہلے کھانا تو بھڑ ليو۔۔۔“

نرملہ کی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی۔ ”اب یہ بتلاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا؟“

میرس کلج کی سیاست شروع ہو جاتی، لاج وہاں سے نفٹھ ایر پاس کر چکی تھی اور اب بی۔ اے کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

”راجکماری شوپوری لاہور جا رہی ہیں۔“

”لاہور۔۔۔؟ ارے باپ رے باپ۔“

لاہور بہت دور تھا، بالکل دوسرا کرہ کہتے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے راجکماری

سنگاپور جا رہی ہیں۔

”افوہ۔“ گھنگرو باندھے باندھے باہر آ کر نرملا اظہار خیال کرتی، پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی لیکن پچھلے سال جب وہ بیمار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سو یواستوا، جو نابینا تھے اور میرس کالج کے اسٹاف پر تھے، شام کو آ کر اسے ایک گھنٹہ ریاض کر دیتے تھے اور شہو مہاراج کے گھرانے کے ایک کتھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لامارٹینز میں نرملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینئر کیمرج کریں گے۔

”کتنی عجیب بات۔ یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے۔ ارے واہ۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی جگہیں دیکھوں“ اس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

”پنجاب ہے نا۔۔۔ وہاں ان کی یونیورسٹی بھی ہے، اس میں وہ ہونے والا ہے، وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندرجیت کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔“

اندرجیت کو ردہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دنوں کے لیے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھکنڈے یونیورسٹی۔ باقی کہ جو انورسٹی یعنی کیتنگ کالج تھا، جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے، وہ تو

ایک قسم کا اندر لوک تھا جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرے پر سے سر اٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے: ایک دو تین چار پانچ۔۔۔ پورے پانچ سال بعد ہم اس اندر لوک میں پہنچ سکیں گے، ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

”بڑے آغا صاحب نے آج گاتری نغم کو پھر ڈانٹ پلائی۔“

”تھیوری کی کلاس کے لیے لیا اویدی آئی تھیں؟“

”سنا ہے اب کے سے تھرڈ ایر کے ایکسٹرئل ایگزامنرونا ٹک راؤ پٹور دھن ہوں گے۔“

”ارے ہائے۔۔۔ وہ بڑے سخت آدمی ہیں۔ وائیو میں انہوں نے میرا پٹرا کر دیا تھا۔“

راج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا اور بھٹکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیا، راجکمار، یہ سب لڑکیاں اب اسٹاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈیو اسٹیشن کھلاتا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لیے ریڈیو اسٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصبہ بانی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی، پھر نیاز فتح پوری کے داماد مجدد نیازی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارچنا لہری تھی اور بہت سی بنگالی

لڑکیاں۔ سورج بخش سر یو استوا تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر۔ الیاس خانے اور جانے کون کون۔۔۔ ایک سے پائے کا کلاکار پڑا تھا۔

”پر راجکماری ہم سے الگ اتنی دور جا کر بور نہیں ہو جائیں گی۔؟“ نرملا نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”جب بھین اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے کے لیے کراچی گئے تھے تو مجھے بھی سنگ لے گئے تھے۔ یاد ہے۔؟ لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے۔“ لاج کہتی۔

”مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے۔“ میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی، مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ ”تم کو کیا پتا اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔“ لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر چم چم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، زندگی پیش منظر کا جو دھندلا سا اٹکل پچو خا کہ ہمارے ذہنوں میں تھا وہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچتا رہتا۔ شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے)، دور سنگ سرخ کا پل، بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھاڑے والی کوٹھی کی محفوظ کائی آلود سیڑھیاں۔ جغرافیے کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے۔ اس کے آگے کیا ہے۔۔ اور کیا کیا ہوتا ہے۔

”آپی بدا ہو کر کہاں جائیں گی؟“ اکثر نرملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر بیٹھتی۔

”وہیں جائیں گی جہاں بھیا صاحب لے جائیں گے اور کہاں جائیں گی۔“
میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

”بھیا صاحب کہاں جائیں گے۔“

”کیا معلوم۔“ میں سٹ پٹا جاتی۔

(اب کمال اپنے کونے میں سے اٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے ٹک گیا۔ گویا طلعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اس نے گویا کیولے کر کہنا شروع کیا):

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپنی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی۔ گا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کو پر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی نائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتاجی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

کی طرف کوئی نہ جائے، وہ عموماً لان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، سیمبل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ہمارے یہاں، ان کے یہاں، سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب چچا بابا کا سوئزر لینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو سوئزر لینڈ سے واپس بلایا گیا۔ بھیا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں الموڑے پہنچے تھے۔ ابامیاں ان دنوں الموڑے میں تعینات تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے سوئس اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے ٹیچر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پوٹے روتے روتے سوچ گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انہوں نے مجھے اور اپنی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے می لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ طلعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ لالچھی کے درخت پر چڑھی ہو م ورک کر رہی تھی۔

لالچھی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ پہلو کے برآمدے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنو مین بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلاً ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ

کر جیتے تھے۔ مئی ان پر عاشق تھیں۔ ان کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جپتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

گر میوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب لامارٹینر کالج میں داخل کر دیے گئے جو ڈیڑھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارٹن فرانسیسی کے روپے سے یورپین لڑکوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں؟ میں کہانی سننے بیٹھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی تو طے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں، بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا ہے تم سمجھ دار ہو، خود ہی تم نے اندازہ لگالیا ہو گا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوایئر ہوتے ہیں، اگر تم قدامت پسند تماشا شانی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی جھنجھلاہٹ ہو گی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس

کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین مین چارلس بوئیر تھے۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و لہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا جب وہ 'ت' اور 'ڈ' کے تلفظ کے ساتھ رک رک کر انگریزی بولتے تو مت پوچھو کہ کس طرح از ابلا تھو برن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

رہیں اپنی۔ تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لیے پکوان بناتیں یا پل اوور بنیتیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مشغلے میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں۔ اپنی لامارٹینر گزلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جو نجف اشرف کے قریب ندی کے دوسرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر خورشید منزل کی اونچی عمارت، جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشید زادی کے لیے بنوائی تھی، اس کے چاروں اور خندق تھی اور یورپین وضع کے کنگورے۔ سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپی رہتی۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اونچے کنگورے اور برجیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکیپ مصور کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے۔ اکثر جب بناری باغ جاتے ہوئے پل سے اتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپنی مجھے قلعے کے کسی درتپے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابل بیان

سکون رچا تھا۔

بھیا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سرکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لامارٹینر کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے یا ٹہلتے یا کبھی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ان کی طبیعت میں جو دھیماپن، جو کھوئی کھوئی اداسی تھی اس نے ان کو اور زیادہ رومینک بنا دیا تھا۔

دیکھئے، میں عرض کروں، مجھے اس لفظ رومینک سے دلی نفرت ہے۔ یہ کوئی میں خواتین کے رسالے کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاندنی رات اور گلاب کے شگوفوں اور والتس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیرا چھا خاصا ہسپانوی بل فائٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہئے اور بحیثیت قصہ گو میری بد قسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لامارٹینر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں ہنستے تھے۔

سینئر کیمبرج کے بعد بھیا صاحب انٹر میڈیٹ کے لیے کالون تعلق دار کالج میں آگئے جو ہمارا خاندانی کالج تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کئی پشتوں سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیا صاحب دوسرے ڈیکیڈنٹ ریکس زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستارہ بجاتے۔ سال بھر بعد وہ سرک عبور کر کے کیننگ کالج میں داخل ہو گئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورنڈابن کے کنہیا بنے رہے۔

اپنی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپنی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں، یہ اپنی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج و قی سر یواستوا اپنی کی سب سے پیاری گویاں تھیں۔ یہ میرے چہیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں، پر اکثر ایسا ہوا کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چپ ہو جاتی۔ اپنی بے پرواہی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شکر بے وقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کر دیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لیے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چمپا باجی کے پس منظر سے ہمیں واقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا باجی مڈل کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لاء کر رہے تھے اس وقت چمپا باجی نے بنارس سے آ کر ازابلاتھو برن کالج میں داخلہ لیا۔ یہ سن انیس سو اکتالیس عیسوی تھا۔

اپنی لامارٹینئر اسکول سے ازابلاتھو برن کالج آ چکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معر کے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی محفلیں، سوسائٹی کے ڈرائنگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

جس سال اپنی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپنی کی شادی کی بات
ٹوٹی۔

اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں، وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس
تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں
کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی کے
وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر
سے گزرنے والی کہانیں، وہ بوڑھیا جو سرخ لہنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر
املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے
معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی۔ جی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔
پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی غیر ضروری جزویات سے احتراز۔ یہی
سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے
لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضاء، اس ماحول اور اس وقت
کا سارا تاثر، ساری خواب آگیاں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے
ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں
آرٹسٹ نہیں ہوں، کمیونی کیٹ نہیں کر سکتا۔ طلعت شاید ایسا کر سکے۔

بہر حال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھئے۔ یہ بینٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اونچی شہ نشین میں بیٹھا ہوں اور

ریڈیو کے لیے کانووکیشن کی کومنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کوآڈرینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں ملبوس مخلوق ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ سرسبز گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور لالہ کے تختے۔ سنگ سرخ کی عمارات کے سائے ساریوں اور سیاہ چغوں اور فیکٹی کے زرتار منقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سنسناہٹ میرے کانوں میں آرہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستے کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے کوآڈرینگل کی طرف جا رہے ہیں جدھر ایٹ ہوم کے لیے سفید میزیں بچھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر یکلاخت نیو تھیٹر زکانیا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے:

”یہ کوچ کے وقت کی آواز۔“ پہاڑی سانپال کی آواز سارے میں گونجتی جا رہی ہے۔۔۔ پہاڑی سانپال باوامی ریشمیں کرتا پہنے، دھوتی کا لمبا پلو ہاتھ میں سنبھالے میرس کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی بنگالی لڑکے سے باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلہ تھو برن کالج کی لڑکیوں کا پر اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغادری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہوگا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوجے متر ہری شکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔

ہلو۔۔۔ میری آواز آرہی ہے۔۔۔ ہلو۔۔۔

ہلو۔۔۔ ہاں۔۔۔

(ہری شکر نے، جو لیمپ کے پیچھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا، جواب دیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اسٹیج کے باہر سے اس کی آواز مائیک پر گونجتی ہوئی آرہی ہو، وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔)

ہلو۔۔۔ ہلو۔۔۔ میں، ہری شکر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں ہری شکر سر یواستواء، کمال کا ہمزاؤ۔ لاج اور زملا کا کلوتا بڑا بھائی۔ چمپا باجی کا رفیق۔ میرا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں؟ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں؟ یہ بڑا اگلیا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں۔ گلاب، لالہ، سویٹ پی۔ درختوں کی ہری نارنجی پتیاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جھلما رہی ہیں۔ اپنی گاؤں پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں۔ بھیا صاحب اور چمپا باجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ کیننگ کالج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالین بچے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں۔ اب مجمع کم ہو گا۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویریں کھینچوانے حضرت گنج جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے، پھر ان موقعوں کے

گروپ فریم کر کے دیواروں سے لٹکا دیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور ان کے کاغذ پیلے پڑ جاتے ہیں۔

کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چھیتا دوست ہوں۔ اس کی بہن تہینہ سے، جسے گھر میں اپنی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی لاج اور نرمل سے، لیکن میرا اور کمال کا اپنی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ ”اللہ، ہری شکر ہمرے لیے بانا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلواتے لانا۔“ اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہماری ساری کب تلک رنگ کر دیں گے؟“ ”اے جناب! حضرت گنج جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری والوسکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا۔“

”خدا کے لیے اپنی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی“ میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا، ”اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے، وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔“

”اے بھین۔۔۔ میرس کلج جا کر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا کہ نیڈل ورک کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں۔۔۔“ لاج کھڑی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ غصے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیلوں کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹنا ہوا ندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈبو دوں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آ کر نیڈل ورک کے رسالوں اور سینما

کے ٹکٹوں کی فرمائش کیا کریں گے۔

میں ایک پیرسائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر ٹکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

”میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شکرمیاں، ٹیگور لائبریری تک جا کر۔“
اپنی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”بھین، آج شام کو کچھ نہیں دکھلاؤ گے۔“ لاج اپنی کی شہ پا کر بولتی۔

”چپ رہ چڑیل۔“ میں غراتا۔

”اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چار دن کے لیے نہر میں مہمان ہے۔“ اپنی بڑی رقت خیز آواز میں کہتیں۔

”اور کیا۔ کر لو کمینہ پن۔“ لاج حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی۔

”ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاؤس لے جا کر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری لاج اور اپنی ہیں۔“

”چمپا باجی۔۔۔ ان کا کیا ذکر ہے۔“ میں ہڑبڑا کر کہتا اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زناٹے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپنی اور کمال کی چھوٹی بہن طلعت میرس کالج سے لوٹتے ہیں میرے گھر میں رک جاتیں۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے فنڈ کو اپنی کونجی کی طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سناٹا طاری ہوتا اور اداسی اور موسم کے سارے

پھولوں کی مہک۔ ندی کے پانی کی پرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی اور جانے کا ہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔ میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔ اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی تھی۔

جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹے تو صبح صبح ہلکے خنک دھندلے میں سندیلے کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا تھا۔ (کمال نے کہنا شروع کیا) ”یہاں لڈو ہوتے ہیں۔“
شکر نے خیال ظاہر کیا۔ عین اسی وقت ”لڈو سندیلے والے“ کی صدا سنائی دی۔ سرخ بھری کے پلیٹ فارم پر نستعلیق قصباتی شرفاء انگرکھے، دوپلی ٹوپیاں، سفید ڈھیلے ڈھالے پا جامے، اجلی دھوتیاں پہنے، دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹہلتے تھے۔ پلیٹ فارم کے کنارے چند پالکیاں رکھی تھیں۔

سفید پھولوں سے گھرا ہوا اسٹیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔
باریک سرخ کانڈ میں لپٹی ہانڈیوں میں رکھے ہوئے لڈو بیچنے والوں کی صدائیں۔ دور سرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہو کر جھکو پہکو روتی اسٹیشن کے پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے آگے آگے تین چادر دیہاتی چل رہے تھے۔
دولہا نے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اوپر کی برتھ پر سے شکر نے آواز لگائی:

”میں ذرا بھیرو کا ریاض کرنا چاہتا ہوں، اگر تم براندہ مانو۔“

”میاں تم کو کون منع کر سکتا ہے۔ تم بھیرو چھوڑ.....“

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ رے۔۔۔ رے۔۔۔ دھاپا۔۔۔ گا۔۔۔ اوہو۔۔۔ ہو۔۔۔ جاگو۔

ارے۔۔۔ بھائی جاگو موہن“۔۔۔ اس نے دھاڑنا شروع کیا۔

”لا حول ولا۔۔۔ کس قدر ایلی منتری بھیرو۔۔۔ یہ والا بھجن تو فرسٹ ایر میں

سکھلایا جاتا ہے۔“

میں نے کروٹ بدل لی۔ ”اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لڈو کھانا چاہتا

ہوں۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”اے میاں۔ اے بھائی۔ جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔ تم خود کسی دن مجھ

سے یہی چیز درت میں سننا۔ اے بھائی۔“ میں نے آدھی بات شکر سے کہنے کے

بعد پھر لڈو والے کو آواز دی۔

”کہئے مہربان۔“ لڈو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر نہایت

شائستگی سے دریافت کیا۔

”جاگو۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ اے کیا مرکیاں لیتا ہوں۔“ شکر چنگھاڑتا رہا۔

”ذرا دماغ پر زور ڈالو اور تصور کرو کہ برابر والے ڈبے سے ایک مدھرتان بلند

ہو۔۔۔ گوال بال سب گئیں چراوت۔“

اس نے انترہ اٹھایا۔

”تمہرے درس کو بھوکے ٹھاڑے۔“ میں نے غصے کے ساتھ گرج کر آواز

ملائی۔ ”میاں شکر یہ باتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔ تم نے کانن کا وہ نیا فلم

دیکھا ہے۔“ جوانی کی ریت۔۔۔“ کہ:

”موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ۔“

”کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزا پور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔“

”کیوں گپ مارتا ہے بے۔۔ مرزا پور میں جھینک رہے تھے۔ تم مجھے نہ بھیجو وہاں جھینکنے کے لیے“ میں نے غصے سے کہا۔

”چلا جا بھائی اللہ تو ہی چلا جا۔۔ اور میری جان بخشی کر۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہانکتا ہے مامعقول۔ خود ہی خود بردھوے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ میں ساری چھٹیاں اکیلا مسوری میں بور ہوتا رہا اور ہری شنکر سر یو استوا تھے کہ مرزا پور میں بیٹھے کجریاں الاپ رہے تھے۔ اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کہ فوراً لوٹو۔ کلیان پور سے اپنی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کرائسس درپیش تھا۔ اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیا نے بیاہ کے لیے ہاں کر دی تھی۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ بھیا نے ہاں کی تو لڑکی ندارد۔ اطلاع ملی کہ اپنی نے انکار کر دیا ہے۔ اب گھر پر ہائی کمانڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ شنکر بھی مرزا پور سے لوٹ آیا تھا اور لاج کے میاں سے ملنے کے لیے دلی پہنچا ہوا تھا۔ میں نے مسوری سے اس کو تار دیا۔ مراد آباد کے اسٹیشن پر وہ مجھ سے آن ملا۔

”بھیا کی شادی کا کیا ہوگا۔“

”بھیا نہیں۔ لاج ہزل سے پوچھنا کوئی لونڈیا ہے ان کی نظر میں۔ یہ اس قدر لڑکیاں دنیا بھر میں بھری ہوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔“

”چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہوں گی۔ کیلاش ہوٹل ہی میں رہیں گی نا۔“ شنکر

نے یکخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”پتا نہیں۔“ میں چپ ہو گیا۔ ”لاؤ ایک بیڑی دیو۔“ میں نے کچھ دیر بعد خالص یکے والوں کے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اوپر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آ رہے تھے۔ عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھان متی کا پٹا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

چمپا باجی اس میں ایک ڈسٹرب کرنے والے عنصر کی حیثیت سے آشامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ بجز ایک سندیلے کے لڈو کے۔ میں نے شکر سے کہا: ”لڈو پھینکو۔“

”سہا پت ہوئے۔“ اس نے اطمینان سے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا چمپا باجی نے منگوائے تھے؟“

”وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھیا صاحب ہوں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔“ شکر نے عقلمندی سے کہا۔ ”تم بھیا صاحب نہیں ہو، میں کمال رضا نہیں ہوں۔ اپنی چمپا باجی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے۔“

”یہ ویدانت کاریکٹ مت چلاؤ سویرے سویرے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا۔ لڈو لیو۔“

”تمہاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مرزا پور میں۔“ میں نے کروٹ

بدلتے ہوئے کہا۔

”ہاں آں۔ ہوئی تھیں۔“ اس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ”مگر خاطریں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال۔“

یہ شکر کا باقاعدہ کریم بنا جا رہا تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں بردھوے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ٹھاٹھ تھے بھائی کے۔

”اب تو لاج کو بد کر کے بندہ چین کی بنسی بجائے گا۔“ اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”کھینے۔۔ بہن کو بد کرتے سے بجائے اس کے کہ روؤ، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لونڈیوں میں گھومنے کی۔ یہ تمہارا اسٹوڈنٹس فیزیشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارے کا سارا۔ اس ہیراوتی پاڈے کا کیا ہوا۔“

”اور میں تم سے سوال کر سکتا ہوں کہ لاہور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ الہ آباد میں جو تھی شو لیا! بہادری۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

”میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح۔۔۔“

”اور کلکتے میں جو ہے وہ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ مدھر لیکھا مو جو مودور۔“

۔۔۔ شکر نے ہونٹوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لہجے میں کہا۔

”جی تو لاج اور اپنی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چڑھتی ہیں۔“

میں نے اعتراف کیا۔

شکر دفعتاً بڑا اداس ہو گیا: ”دیکھو بہنیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور وہ بد اہو جاتی

ہیں۔“

ہاں۔ میں چپ ہو گیا۔

لاج نے مجھ سے کہا تھا۔ ”کمال بھیا: چمپا باجی ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دکھی ہوں گے۔“ لاج میں یہ چھٹا حس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ لڑکیوں کی تھاہ کون پاسکتا ہے بھلا۔
”شکر۔“

”ہاں یار۔“

”تزنین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں۔“

”اسکرپٹ چمپا باجی کے پاس ہے۔ چلے جانا کیلاش ہوٹل۔ کیا رکھا ہے۔“
جوبات میں ختم کرنا چاہتا تھا شکر معاً اسی نقطے پر پہنچ گیا۔
”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پتا نہیں۔“

یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔
ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔

ضرور جاؤں گا کیلاش ہوٹل۔ واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر، وہ میرا کر ہی کیا سکتی ہیں؟ وہ پیلی رنگت والی دہلی پتلی لڑکی۔ متوحش آنکھوں والی۔ یونین میں تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ ابھی تک یہی طے نہیں کر پائیں کہ مسلم لگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ ہر قسم کی عقل سے معذور۔ ایک ہزار بار سمجھایا ہوئی جہاز ایسے اڑتا ہے، ریڈیو ایسے بجتا ہے، گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے مگر ہر دفعہ مرغی کی وہی ایک ٹانگ کہ میرے پلے تمہارا

سائنس نہیں پڑتا۔ واہ کیا ادا ہے۔ جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں۔۔۔ مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار رہے کہ اگر بھولے سے باجی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔ میں بہت معمولی ہوں۔ انہوں نے بھیا سے کہا تھا۔ بھیا کون آئن سٹائن تھے۔ میں کون مارشل فوش ہوں پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرما رہے تھے تو لگتا تھا ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس آف لارڈز میں بحث کی جارہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھارہویں صدی کی نثر پر لیکچر دے رہے ہیں۔

اپنی نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ شادی سے انکار۔۔۔ شکر نے دفعتاً سوال کیا۔ میں نے غصے سے دانت پیسے۔ میں اس شکر سر یواستوا سے عاجز تھا۔ جو بات میں سوچتا تھا وہ بے تا رہتی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی۔ یا پہلے سے ہوتی تھی۔۔۔ ہمزاد کی طرح کہیں اس سے مفر نہ تھی، اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا پریم ہنس بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور راجن کا درجہ رکھتے تھے۔ اکثر یہ درجے ادا لتے بدلتے رہتے تھے۔ جب سے چمپا باجی نے بنارس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشق حقیقی میں مبتلا ہوں۔ نہایت ڈھٹائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا: ”چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔۔۔ ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لائق۔۔۔ مگر یہ کہ۔۔۔“

اور چونکہ اپنی سے بھیا کی مگنی ہو چکی تھی اور اپنی بھیا صاحب کو عام ہندوستانی

لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے دے رہے تھے لہذا یہ سچویشن بے انتہا گنجلک ہو گئی تھی اور یہ شکر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں، اپنی کا اور ان کا کیا مقابلہ، پھر اسے بھیا صاحب کے اس چڑفتائی پن پر غصہ آتا کیونکہ لاج کی مانند اپنی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اور یجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھر کم تصورات لیے بیٹھے تھے۔

”اپنی کیا کریں گی؟ ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جاسکتیں۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔

”ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔۔۔“ میں نے کہا، پھر مجھے ایک وحشت خیز خیال آیا۔۔۔ اپنی۔۔۔ کیا لاج کی طرح میں ان کو وداع نہیں کر سکوں گا۔ اپنی کی شادی کس سے ہوگی؟ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہو گی؟ بھیا صاحب کس قدر کمینے، ذلیل انسان ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ اپنی ہی نے انکار کر دیا تھا مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔ عزت نفس۔۔۔ خودداری۔۔۔ وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے، ہم سب کو بے حد اہم اور زوردار لگتے۔ ان کے الفاظ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ نہ مجھے نہ اپنی کو۔۔۔۔۔ نہ غالباً چمپا باجی کو۔۔۔

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مضافات میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا
کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس میں آم کے پتوں کی مہک تھی۔ اب میلوں دور تک
عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آ رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پٹریاں۔
ریلوے ورکشاپ۔ کنارے کنارے پر پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے
سامنے اینگلو انڈین بچے کھیل رہے تھے، پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی
ہوئی چارباغ جنکشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کی سنگ سرخ کی راجپوت، مغل طرز
کی سینکڑوں فلک بوس برجیوں، گنبدوں، میناروں اور شہ نشینوں والی طویل وعریض
عمارات کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا تو دل ڈوب سا گیا۔ ہم
لکھنؤ پہنچ گئے۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔ گھر آ گیا۔۔۔ گھر۔۔۔

پلیٹ فارم کے شفاف سرمئی فرش پر لوگ نرم روی سے ادھر ادھر چلتے پھرتے
تھے۔ چیخ پکار تھی لیکن اس شور و شغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں
میں آتے تھے وہ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

اسٹیشن کی برساتی میں موٹر داخل ہوئی۔ جسے قدیر چلا رہے تھے۔
موٹر میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کا رخ کیا۔ شکر کو سنگھاڑے والی
کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل اندھیرا۔ جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد
نہ آتا ہو، پھر یہ ذہنی بلیک آؤٹ ختم ہوا اور کمال نے دوبارہ کہنا شروع کیا):

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے جب میں گھر پہنچا اپنی اپنے کمرے میں بیٹھی اکناکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھیں تھیں۔ قدیر کی بی بی بڑی مصروفیت سے پان بنا رہی تھیں۔ میں کوٹھی کے خاموش کمروں میں ادھر ادھر گھومتا رہا، پھر میں نے اکتا کر شنکر کو فون کیا۔ معلوم ہوا اسٹیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوٹل پہنچا، وہاں مسز وانچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باجی ابھی نہیں آئی ہیں، وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں بھینسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا، وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں، وہ بھی بڑی مصروفیت سے اکناکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔

دوسری کرسی پر بھیا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجے، وہ تو یہاں موجود تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اٹھے اور ”ہلو کمال، مسوی سے لوٹ آئے۔“ کہتے ہوئے برساتی کی طرف بڑھے جدھر ان کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرے لمحے وہ پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

آخر میں ایک ڈک چیئر سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”بڑی گھام ہے۔“ چمپا باجی نے بے دھیانی میں درختوں کی اور دیکھتے ہوئے

کہا۔

”بھیا اتنی جلدی اٹھ کر کیوں چلے گئے۔“ میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہوا پور یونیورسٹی کا کانووکیشن۔۔ میں نے بید لی سے دیکھا۔

”اللہ بہتر جانتا ہے۔۔ یا تم۔۔ تم ان کے کزن ہو۔۔“

”بجیا۔۔۔ یہ اپنا پارٹ لیجئے۔۔۔“

”تمہارے گھر میں۔۔۔“ انہوں نے کاغذات اٹھا کر کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ایک کرائس آگئی ہے۔“

”بجیا۔۔ یہ دوسرا اسکرپٹ مکمل کو دے دیجئے گا۔“

”تمہارا ہمزاد ہری شکر۔۔ تم نے اسے کہاں روانہ کر دیا۔۔۔ آیا نہیں تمہارے ساتھ۔“

”پتا نہیں کہاں ہے اس وقت۔۔۔ دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔“

”تم لوگ۔۔۔ کس قدر ڈریمیٹک ہو۔۔۔ چمپا نے کہا۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا، وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں جیسے وہ ان کا ہاتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آ گیا تھا۔

”کہاں گئے ہیں تمہارے بھیا صاحب۔۔۔“

”جی۔۔ کیا اس تھی۔ ہم سے سے خفا تھی۔

اندر ریڈیو سے گیان وتی بھٹناگر کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون اور شدید اضطراب اور جولانی کی دھوپ۔

(پھر طلعت نے کہنا شروع کیا): فٹن موڑ پر سے اترتی ہوئی سڑک کے
گڑھوں پر سے گزر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔
یہ اس سال کی بات ہے جب اپنی

----- اختتام صفحہ نمبر ۲۲۴ ----- از ----- شہزاد رضا

دریا۔۔۔ صفحہ نمبر ۲۲۵ سے۔۔۔ علی رضا صاحب۔۔۔۔۔
کی منگنی ٹوٹی۔

لاج اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے زعفرانی سارے باندھی ہے۔ اس کی
شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپنی اس کے ساتھ ساتھ
برساتی میں آگئیں۔ اپنی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ خالی وہ لڑکیا، جن کا بیاہ ہو
جاتا ہے، یہ زیور پن سکتی ہیں۔ جب اپنی کا بیاہ ہوگا اور یہ بچھوے پہنیں گی تو ان کے
چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر
ننگے پاؤں ساری کا پلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اڑسائے وہ مصروفیت
تمکنت اور گمبھرتا کے ساتھ ادھر ادھر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔

مگر بیاہ کی تو آج قدر کی بھی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے منا ہی کر دی ہے

میں گاڑی سے کود کر اندر بھاگی۔

”اپنی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن سے آکر مال بھیا آپ کو
پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکیلہ کو اتارنے کے لیے بھینسا کنڈ کی طرح سے
گزری تو وہاں چپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا۔“

”کون دونوں۔۔۔“

”بھیا صاحب اور کمین بھیا۔۔۔ چھتریوں کے نیچے، وہ املتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ماموں کے گھر میں، وہیں۔ ہماری فٹن سڑک پر سے گزرتی دیکھ کر انہوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلایا اور مسکرائیں۔۔۔ بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔“ میں نے مستعدی سے ایک سانس میں سب بتا دیا۔ اپنی اور لاج خاموشی سے روش پر سے گزرتی برساتی اور بڑھ گئیں جیسے انہوں نے مرینی بات ہی نہیں سنی۔

میں چنبیلی کی جھاڑی پھلانگ کے نرملا کی اور چل دی، وہ اور مالتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں بیٹھی تھیں۔

”بھین تو مرزا پورا وردی گئے تھے نا۔“ مالتی نے پوچھا۔

”ہاں صبح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں۔ اس سے ویسے ڈٹے ہوں گے۔“

”چمپا باجی کو اس روز میں نے گلہتری کے گھر پر دیکھا تھا۔ لال ہری اہریہ کی ساری پہنے اتنی سندر لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں۔“ مالتی نے کہا۔

”بھین تو ہمارے لیے بھی اس قدر پیاری بے پوری چڑی لائے تھے کہ بس۔ جب کمال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے۔ تب نرملا نے لاج اور اپنی کی لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایسا سندر لہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لیے۔ سیر بھر تو اس پر گوکھروہی ہوگی۔ لالوال جگل کشور کے یہاں سے۔“ نرملا نے اطلاع دی۔

یہ گوکھر واور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دوالی، عید، بقر عید اور بس۔ اپنی وغیرہ کے ٹھاٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لیے ایک سے ایک بڑیا ساریاں اور ڈھیلے پانچامے اپنی الماریوں میں سے نکالتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا نیونک لادو اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دوسرا کوئی منحوس فراک پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اور پٹرل راشنک ہوئی تھی فٹن ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موٹر صرف والدین کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ عید، بقر عید اس زبوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنوا دیا جاتا۔ اب اسے لادے ہاتھوں میں ڈھیروں چماچم کرتی بنارس کی نگوں والی چوڑیاں پہنے بیگمات کی طرح ٹھسے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دہاڑتا۔۔۔۔۔۔ سنا ہے آج بریلی کی ساری کاجل کی دکانوں میں ڈاکا پڑ گیا۔۔۔۔۔۔ بھیا صاحب فرماتے۔۔۔۔۔۔ یہ کاجل کی لکیر کے ایکشنشن کا کیا مقصد ہے۔۔۔۔۔۔ اگر ڈھیلا پانچامہ پہنا ہے تو قرینے سے بیٹھو درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو، نیک بختو۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تیج تہوار کا دن یوں نصیحتے میں کتنا، پھر نرملا کی اجار (ازاریو۔ پی کی غیر شادی شدہ کاستھ لڑکیوں کا پانچامہ جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا) اور ہمارا ڈھیلا پانچامہ اگلے تہوار کے لیے اٹھا کر رکھ دیے جاتے۔ دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نرملا اور مالتی جب چنز یوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نرملا نے گہنوں کا قصہ نکالا۔ اس بھات پہ تبصرہ کیا گیا جو دے ماما لاج کے لیے لانے والے تھے۔ اس میں

کی اس شعبہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔“ طلعت نے اداسی سے کہا۔
 ”میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔“
 ”تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا۔“ ہری شنکر نے کہا۔
 ”میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“ کمال نے پھر ضد سے
 دہرایا۔

”وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔“ طلعت نے کہا۔
 یہ لوگ، جولینڈن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے ۱۹۵۴ء میں یہ باتیں کر رہے تھے ان
 کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔
 موٹریں آ جا رہی تھیں۔ ریڈیو میں س ے وی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آرہی
 تھی۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۰ء کی جوانی میں سنگھاڑے والی کوٹھی
 کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور ماتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس
 لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہسپتیاں تھیں۔ مہا تما بدھ شاکیہ منی نے کہا
 تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور
 بڑھاپے میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔
 پہاڑوں پر گلیشئر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ اندھیرا۔ وقت جو سیال
 تھا۔ وقت جو برف میں منجمد تھا۔

”ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”کیونکہ
 ہم بہت خوفزدہ ہیں۔“

”ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔“ طلعت نے کہا۔

”اور گوتم نیلمبر کا ذکر یہاں نہ کرنا۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔“ کمال نے کہا۔

”میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی گنی ہیں تب یہ تینوں مرجائیں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔“

ہری شنکر نے کہا۔

(وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اس پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے اور آگے۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکروں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکروں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں دیے جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ شیڈ پر برساتی پروانے کے چکر کاٹ رہے تھے۔

لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

سیتل پانی پر اوے دے رنگ کا کم خواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ بڑے اہتمام سے طلعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طلعت بڑی ماہر فن سمجھی جاتی تھی۔ لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ قریب ہی مالتی رائے زادہ بیٹھی تھی۔

پھر جب رات زیادہ ہو گئی تو نیشے سے انگا دین نے، جواب تک حوض کی منڈیر پر بیٹھا جمنامہری سے باتیں کر رہا تھا، آواز لگائی۔ بیٹا چلے۔ مالتی کو شہر جانا تھا، وہ بارود خانے میں رہتی تھی۔

”بھین آجائیں تو موٹر سے تم کو پہنچا آئیں گے۔“ لاج نے اس سے کہا۔

طلعت ان سب کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتری اور اب فٹن نے رائے بہاری لال روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد فٹن ایک بڑی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ پلنگ کے قریب ٹیبل فین رکھا تھا صراحیاں گھروچی پر دھری تھیں جن پر چنبیلی کے کجرے لپٹے ہوئے تھے۔ چبوترے کے سرے پر چھت والا راستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باورچی خانے کی طرف

جاتا تھا۔ ادھر بگھاری کی خوشبو آرہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی نکھی تھی نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جگمگاتے تھے۔

”کہو۔۔۔ گوٹ تراش آئیں۔۔۔“ اماں بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائینچے سمیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اللہ رحم کرے۔۔۔ لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختہ مشق نہ بناؤ بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے الٹے تلے نہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برابر کر دو تو نئے بنوادے جائیں گے۔“ کمال نے کتاب پر سے سر اٹھا کر آواز لگائی کہ وہ برآمدے میں در کے قریب ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہا تھا۔ اپنی کھانے کے کمرے میں کچھ سڑپڑ کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لیے جب وہ باورشی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طلعت نے ان کو آواز دی۔۔۔

”اپنی اکل لاج نے تم کو بلایا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

”لاج باہر نکلتی۔۔۔ کیا ابھی سے مائیوں بیٹھ گئی ہے۔“ خالہ بیگم نے پوچھا۔

”جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تک ہے۔“ کمال بڑبڑایا۔

”گونا تو اس کا بی۔ اے کے بعد ہوگا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا

کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیے۔ نکاح ہو جائے۔ رخصتی اپنے جب دل میں آئے ہوتی رہے گی۔“ خالہ بیگم نے کہا۔

اپنی کے بیاہ کا مسئلہ پھر سے چھڑ گیا۔ طلعت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان ”گلفشاں“ کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی۔ دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں ان کے پھانکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقفیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام، لوگ، خاندان، وجود کے تانے بانے، جھیلے، گلفشاں کے پھانک کے اندر ایک حوض تھا اور سیمنٹ کی ایک نالی، جو ستونوں پر بنی تھی، باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موٹر لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے کی فرنچ کھڑکی پڑتی تھی جس میں اسٹینڈ پر آفتابہ رکھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فرنچ درتچے میں سے جھانک تو اندر رکھنا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں شیشے کے لمبے لمبے درتچے تھے۔ گول کمرے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھیا صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا جہاں برساتی تھی۔ اس کے آگے موٹر خانے کی طرف سڑک جاتی تھی۔ پھر عقبی حصے میں دولان تھے۔ ان کے بعد شہتوت کے درخت اور اس کے پیچھے سیمنٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کالج کی وضع کا تھا۔ یہاں سر کنڈے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لیے آنگن بنا لیے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھوبیوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گٹھی

ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاط گنج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آکر والی بال کے دو کھمبے نصب کر لیے اور ایک شکستہ جالی ان کھمبوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے وہ غریباغریا، آکر والی بال کھیل کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں۔ طلعت پیچھے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم ورک کرتی جاتی عقبی لان کے وسط چوڑی سی روش تھی۔ رام اوتار مالی گھنٹوں کھرپی لیے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا۔ کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی گھونس کر آسمان کو دیکھتا رہتا اور طوطوں کو آم کے درخت سے اڑانے کے لیے عجیب و غریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی۔ ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا۔

احاطے کے پیچھے ایک مندر بھی تھا صبح کو جس کے گھنٹے ٹنائن بجا کرتے۔ مندر کے کنارے دھویوں کے چوہدی کا پختہ دو منزل مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازاد ہاتھو برن کالج کی عیسائی لڑکیاں دھویوں کی بستی میں تبلیغ کے لیے آتیں۔ اردو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برابر کی کوٹھی میں چکروتی صاحب تھے جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کے نام اونیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا جو سونے کے بنگالی وضع کے ٹوپ پہنتی تھی جس میں جھالر لگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔

اونیل کالج میں اپنے حسن کے لیے بہت مشہور تھا اور سنا گیا تھا کہ سجاتا سے اس کا بیاہ ہوگا۔ سجاتا اور نند بالادو بہنیں تھیں جن کے لیے یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس دان تھے۔ سجاتا گلنشاں سے چوتھی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور پرناقی رہتی تھیں۔ یہ تو ام بہنیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کوشنا پدم ہنس کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر چپالز کی کوٹھی تھی جب کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن و ذہانت کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھانکوں سے نکل کر ازبلا تھو برن کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے۔ باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں، مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنیچر۔ ان کے باغوں کے پودے۔ ان کی کتابیں۔ لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم، ان کے نام، ان کی دلچسپیاں۔

طلعت کے یہاں کا خانسا ماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانسا ماں تھے۔ اس کا نام حسینی تھا۔

سارے باورشیوں کے نام حسینی، حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے

دھوئی نھو کھاتے ہیں۔ سب کو چوان گنا دین ہیں۔ ساری نوکرانیوں کے نام بلا قن، رسولیا اور جمیدن کی ماں اور منجور النساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدل کھاتے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں وائلکن نواز ابد اکر ٹونی ہوتا ہے سارے باپوں کا نام خان بہادر ترقی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے باپوں کا نام بھی یہی ہوتا ہے اصلیت والے باپوں کا بھی۔ جیسی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھر ادھر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طلعت کا ایک پرانا وور کوٹ دے دیا تھا جس کے کالر پر فرنگی تھی۔ اب فرکانیش ختم ہو چکا تھا لہذا طلعت اسے کہاں پہنی اور حسینی صبح صبح باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں سوسوسوں کرتا گزرتا اور سودے کے پیسے لینے کے لیے کمرے میں آتا۔ اب وہ فاختنی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدر اس پر خوشدلی سے ہنستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔ ہٹ جاؤ راستے سے۔

قدریر موٹر ڈرائیور جب طلعت چار سال کی تھی، کمال آٹھ سال کا اور بھی صاحب ابھی سوئزر لینڈ میں تھے تب آن کران کے یہاں نوکر ہوا تھا۔ قدریر مرزا پورکار رہنے والا تھا اور بے حد دلچسپ۔ اس کی بیوی کا نام قمر النساء تھا اور بچے کا پھدن۔ جب طلعت کے بڑے ابا اناوے میں تعینات تھے تو ایک مرتبہ پھدن کو ضلع کے بی شو میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھیے کیا انعام ملا، ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساری اور ایک جھنجھنا۔

قدیر کے یہاں اس روز عید ہوگی، پھر ایک روز قدیر کو کیا سوچھی کہ کیمرہ لوں گا۔
 انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بیٹا _____ اے بیگم
 صاحب _____ یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو، میاں قدیر تم کیمرہ کیا کرو گے؟
 بیگم صاحب، پھوٹو کھینچا کروں گا _____ خدائے سے مجھے پھوٹو گرافی کا بہوتے
 شوق ہے _____ پھر قدیر نے اپنی تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سو روپے
 کا کیمرہ منگوایا اور تین ناگوں والا اسٹینڈ اور مور اور محل والے پردے۔ اب دونوں
 میاں بی بی نے شرگردیشے کے آگے سرکنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا
 اور گھر بھر کی تصویریں کھینچی شروع کریں۔ ہائی پور اور یہ اور وہ جانے کون کون لوا
 زمات منگوائے گئے۔ انہوں نے اپنی اور اور بھیا صاحب اور طلعت، کمال اور
 سب کی سینکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ تھیروں کے لیے قدیر کا بڑا زور دار تخیل
 تھا۔ اپنی بیٹھی ستار بجا رہی ہیں۔ پیچھے پردہ پر مورناچ رہا ہے۔ محل کے اوپر چاند نکلا
 ہے۔ حوض پر پرپیاں کھڑی ہیں۔ اپنی قلم ہاتھ میں لیے مفکرانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔
 کمال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنبھالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا
 ریکٹ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور اماں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ
 گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نرمل اور لاج، رادھا اور کرشنا
 کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرمل کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ سخت پشکل والا
 کرشنا کا پوز۔ ہری شکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق
 قدیر کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر
 سکتے تھے۔ اپنی من مانی کرتے تھے لہذا ان کے موڈ کو بلا چون و چرا کیے ان کا حکم

ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھورہے ہیں، سکھا رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویریں بنتی بنتی تھی۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گر میوں کی دو پہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو نوکروں کے کانچ سے قدیر کے آہا گانے کی آواز بلند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں قدیر دہلیز پر اکڑوں بیٹھے پڑول کا خالی ٹین بجا رہے ہیں۔ قمرن ایک طرف کو بیٹھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا، فوراً پیتل کی پن دنیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ قمرن پور کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانولی، سلونی اور سبک بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور نرملا کی والدہ سے ان کا بڑا یا رانہ تھا۔ اکثر سنگھاڑے والی کوٹھی بلوائی جاتیں یا جب مسز رائے زادہ گلنشاں آتیں تو فوراً قمرن کی طلبی ہوتی۔ رنگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باندھے، جس کا پلو سامنے پڑا ہوتا، گھونگھٹ نکالے وہ روش پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے جھانچھن اطلاع دینے کہ بہن قمر النساء آن پہنچیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن قمرن کے پاس جو پورے اٹھارہ روپے میں خریدی تھی اور وہ بھی کلکتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی زیور پہن کر گھونگھٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مہمان بیبیوں کا استقبال کرتیں، ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمر اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے
 ضلع کی کسان سبھائیں شامل تھے اور چرنے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ
 زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پٹے بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے درپے
 تھا، گاؤں گاؤں گھومتا تھا، کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے
 کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی
 اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہو سکتا تھا؟ اسی لیے جب گلشن شاہ کے لان پر
 کمال کے دوست احباب سوشلزم پر لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی
 بہانے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی تو صرف
 یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار، ٹھا کر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز
 جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے
 تو قدیر کو کلکتے جا کر کلیزی کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے
 لالے پڑے تھے۔ ان دنوں، یعنی ۳۱ء کے لگ بھگ، کانگریس نے تحریک چلا رکھی
 تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور
 زمیندار ایک طرف تھے، کسان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک
 زمانے میں قالین بھی بنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی
 وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان
 ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی، مگر اب جو کچھ لکھنؤ شہر
 میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ
 اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو

فرقہ دارانہ رنگ دے رہی تھی تاکہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔

شہر میں رہ کر قمرن کو اپنے مر جا پور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔ رام سیتا کی جوڑی ایسی۔

قمر ابھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ گونا سب ہو گیا تھا۔ یہ شاروا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غربا گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں! بی قمرن اب مر بھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ قدیران سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دنوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ویسے بی قمرن دوسرے ملازموں کی بیبیوں سے میل جول نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موٹر ڈرائیور کی اہلیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانا پکانے، جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر پھدن کو گود میں لیے کوٹھی میں آجائیں اور اماں بیگم کے بیڈ روم میں محفل جمتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹی رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی ہی آڑی آڑی لیٹی ہیں۔ کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم درواز ہیں۔ پاندان سامنے رکھا ہے۔

”آگئیں قدیر کی بی بی _____ آؤ _____ بیٹھو“

قمر بڑی نزاکت سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھدن کو ایک طرف سلا دیا۔ باجی اماں نے پان بنا کر بڑھایا۔

”کہو بی، آج کیا پایا تھا۔“ خالہ بیگم پوچھتیں۔

”ارہر کی دال بھات اور منگو چیاں بیگم صاحب۔۔۔“

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور بھی کے نرخ پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آ جاتی۔ شادی بیاہ کے قسے، کنبے کی سیاسیات، کس کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر لیٹے لیٹے کجریاں گنگنانا شروع کر دیتیں۔ بھری لکری موری ڈھڑکائی شام _____ تو بی قمرن ان کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی پر سنگین میں گالیتیں۔

گانے میں میاں قدیر استاد تھے۔ نوٹنکی کے گانے، تھیٹر کی غزلیں (میں فیش سے پوزیشن سے کھاؤ مٹن چاپ) کجریاں بارہ ماسے، دادرے، ٹھمریاں، برہا، آہا اودل _____ ہر چیز کے بادشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

اٹھاؤ نہ کھجور مڑے گی کلائی

گلا کاٹو نا جک بدن دھیرے دھیرے

اور

شب غم کی آہیں بشر ہو رہی ہیں

مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پٹرول کے ٹین پر آکر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے جو صرف

ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی محفلوں میں پڑھا کرتے۔ ایک تھا:

عطر غلاب خوبو لونڈر نے چھین لی
جنتری کی تمام کھمبیں کلنڈر نے چھین لی
قدیر کلمتہ پلٹ تھے لہذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے کلمتہ دیکھا
جانو لندن، پیرس، ساری دنیا دیکھ لی۔ کمال اور طلعت وغیرہ کے بچپن میں وہ اکثر
اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے
ان کی باتیں گرہ میں باندھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنارس کی ایک تارکوں کی
سڑک پر قدیر بچوں کو موٹر میں بٹھائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طلعت نے نہایت
منکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا: ”یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی
بنتی ہوں گی۔ ہیں ناقدیر۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔ بیٹا۔۔۔۔۔“ قدیر نے گلا صاف کر کے اسی منکرانہ انداز میں
پچھے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا: ”ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچی سڑک پر پالش
کرنے کا ایک ہی روپیہ خرچ بیٹھتا ہے۔“

افواہ۔ پچھلی سیٹ پر سے حیرت و استعجاب کا کورس ہوا۔
وہ کیسے قدیر۔۔۔۔۔ طلعت نے پوچھا، وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔
”اب یہ دیکھ لیجئے۔“ قدیر نے بڑی متانت سے جواب دیا، ”جیسے ایک ایک
روپیہ کر کے سڑک پر بھاتی چلی جائے، اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں۔“ اور وہ
کھنکار کر غور و فکر میں ڈوبے موٹر چلا رہے۔

ایک بار انہوں نے بتلایا کہ کلکتے میں صاحب لوگوں نے یہ ڈونڈیا بیٹیاں کہ جو در
بیر موٹر سے مرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام۔ بڑے بڑے دربیر آئے۔
مہاراجہ بھرووان کا دربیر اور بنگال کے لاٹ صاحب کا دربیر مرغی سڑک پر چھوڑی
گئی۔ کوئی نہ مار پایا۔

نم نے مار دی ہوگی۔ طلعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔
”جی ہاں۔ بیٹا“ انہوں نے جواب دیا۔

”انعام کا کیا کیا“ کمال نے پوچھا۔

”دربیر کی بی بی کے لیے سونے (اس زمانے میں سونا پچیس روپے تولہ تھا)
کے بندے بنوا دیے“

قمرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں قدر بھی اسی نام سے
مخاطب کرتے۔

تیسرے پہر کو کمال اور اپنی اور طلعت اور بھیا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے
لوٹتے۔ گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں برتن
کھنکھناتے۔ چائے کی کشتیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجی جاتیں یا سب اماں بیگم
کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ ایک پیارلی چائے قمرن کو بنا کر دی جاتی۔ اپنی اور
طلعت ان سے کچھ تبادلہ خیالات کرتیں۔ اتنے میں موٹر برساتی میں داخل ہوتی۔
قدیر، خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے۔ موٹر کی آواز سن کر قمرن
گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور پھدن کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کالج کی طرف روانہ ہو
جاتیں۔

وہ بے حد وضع دار آدمی تھیں۔ برسوں اودھ میں رہ لیں لیکن اپنی خوب نہ چھوڑی۔ ایک مرتبہ حسینی خانسا ماں کی بی بی نے ان سے کہا۔۔۔۔۔ اے بہنی۔۔۔۔۔ کبھی کھڑے پانچے بھی تو پہن کر دیکھو۔ اور قمرن نے ہونٹ پچکا کر جواب دیا تھا۔۔۔۔۔ ہم کوئی پتیاں ہوں۔۔۔۔۔ جو ای پہناوا پہنی۔۔۔۔۔ لہذا بہن قمر النساء اپنی گاڑھے کی سفید دھوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہریوں کی طرح انہوں نے آتی ہوں، جاتی ہوں والی زبان سیکھی۔ جب انہوں نے پہلی مرتبہ لکھنؤ کی لڑکیوں کی گفتگو سنی۔۔۔۔۔ بڑی بیٹا اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔ ”اللہ آپ کہاں جاتی ہیں حضور، جائے آپ کا دین ایمان۔۔۔۔۔ یہ اپنی گھن ادائیں تو رکھے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ ذری میرے دماغ میں بھی خناس ہے۔“۔۔۔۔۔ اور کوٹھی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا، مہربان اور ماما ئیں تک ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں۔۔۔۔۔ تو قمرن حیران پریشان کھڑا سنا کیں۔ شاگرد پیشے میں واپس آ کر قمرن خوب ہنسیں۔ قدیر جب باہر سے کام ٹمٹا کر آئے تو ان سے ماجرا بیان کیا۔ شہر کی بیسیاں پتریں ایسی ہوت ہیں۔ سارا پہناوا بھی پتریں ایسا بالے۔ قدیر ان کے اس بھولپن پر بہت ہنسے اور ان کو دنیا کے حالات سے آگاہ کیا کہ یہ پتریں کی بولی نہیں، یہ ٹکسالی اور بیگماتی زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی اب اسی طرح بولا کرو: آتی ہوں، جاتی ہوں۔ اب تو خیران کو لکھنؤ میں رہتے دس سال ہوتے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنؤا ہونے پر ناز تھا۔ ان کے دادا پر دادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے۔ قمرن بے

چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قمرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انہوں نے بھی موخر الذکر خاتون کا کبھی نوٹس نہ لیا۔ ان کی تو نرملا اور لاج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گویاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا نا طہ بری چیز ہوتا ہے۔ کہاں رم دیا ذات کی ابیرن رام اوت ۱۵ رامالی کی بی بی۔ صبح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طلعت کی آیا سوسن کی طرح فلمی گانے گائے نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھر سواں پا نجامہ پہن کر ٹھک ٹھک چلنا اسے آئے، مگر وہی ہم وطنی۔ پردیس کی اس اجنبی دنیا میں رم دیا ہی قمرن کا دکھ سکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مالی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن قمرن النساء کی ہجولی تھی۔ تو رم دیا۔ رم دیا گورکھپوری رہنے والی تھی۔ قمرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ، گونا سب ہو گیا تھا۔ رام اوتارا اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قمرن کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتارا سے ایکے پر بٹھلا اسٹیشن سے لائے تھے وہ رام باس کی سرخ ساری پہنے چہکو پہکو روتی اتریں۔ پہلے انہیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبیوں کے لیے موضوع گفتگو اور لڑکے بالوں کے لیے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دلہن۔ سب سے آخر میں قمرن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دیس کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مسماۃ ہر دیا مرزا پوری میں قمرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ اے لیجئے یہ تو بی رم دیا سے سمدھیا نے کارشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قمرن گویاں تھیں۔

چھوت چھات کے باوجود آپس میں لین دین بھی رہتا۔ قمرن رم دیا کی ہتھیلی پر چاء کی پیتیاں اوپر سے رکھ دیتیں۔ لیو۔۔۔ کوٹھریا ما جائے کے چاء بنا کے پی لیو۔۔۔ اسی طرح پھل پھلاری امرود گنے سنگھاڑے سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی۔ جاڑوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے پھچواڑے پھلاری میں قمرن اور رم دیا کھاٹ پر بیٹھی باتیں کیا کرتیں۔

ساریا ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں۔ چاول بنے جاتے۔ قمرن رم دیا کو کروٹیا سکھاتیں۔ کبھی کبھی حسینی کی بی بی جو بی خانم ادھر آنکلتیں اور دیکھتیں کہ دونوں پور بنیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پر منگو چیاں سکھا رہی ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کر سوسن یا زمر دے کہتیں۔۔۔ دریر کی بی بی نے بھی کیا! اہیرن سے پہنایا گانٹھ رکھا ہے۔

پھر جب پکار فلم نئی نئی آئی اور اس کا ریکارڈ کوٹھی میں پہنچے تو ایک گانا قمرن کو بے حد پسند آیا۔۔۔ دھوبیوں کا گانا جس میں مرزا پور کا نام آتا تھا۔ مرزا پور میں اورن ٹھورن کاشی ہمارو گھاٹ۔۔۔ قمرن طلعت کے کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں بیٹا وہ دھوبن والا تو اچھر بجائے۔۔۔ اس کے علاوہ کنگن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا۔۔۔ ارے ارے کبیر سن رے کبیر۔ رمیا کی جو رو نے لوٹا بجا۔۔۔ اس میں رمیا کی بی بی کے بجائے قمرن، حسینی کی بی بی گاتیں ارو بہت خوش ہوتیں۔ جو با حسینی کی بی بی کسی دوہے میں قمرن کا نام چکا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلاتی۔

گنگا دین سائیس ابھی بچلر تھا لہذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری

خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کہاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتا رتا تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گور کپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطر میں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا، دو تین برس میں بڑی ہو جائے گی، مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنگا دین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سر یو استوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیروں اڑ رہی ہے: دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چاء کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں مل رہے ہیں۔ طلعت تو باقاعدہ میری کالج میں داخل تھی لیکن کمال اور اپنی سارے کزن لوگ پانچوں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں امام باندی میرا سن مع اپنے خاندان کے تقریبوں کے موقع پر آ کر ہفتوں گلفشاں میں رہتی تھی۔ سوسن اور زمر دوارے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جھنکر بنا ہوا تھا، پھر جب قدیر نے پھوٹو گرافی شروع کی تو فی کس ہر طرح کے کیمرے ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہے۔ بلی کتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طرح گرم سدھار کا سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔ تعلیم بالغاں کی تحریک از ابا جھو برن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر لڑکی پر ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم از کم دو ان پڑھ لوگوں کو

زیور علم سے آراستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کیسپس پر کالج کے ملازموں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو آس پاس س غریب غرباء آکر گلفشاں کی برساتی کی میڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیمپ کی روشنی میں الفاظ کے جپے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یاب کرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیمپ بہت مدھم تھا مگر غریب غرباء نہایت ذوق و شوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدیر سخت کندن ذہن ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت سپیریتھے ان خرافات میں کیا پڑتے۔ گنگا دین البتہ انکو چھاسر پر لپیٹتا سب سے پہلے تعلیم بالغاں کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پستک بھنڈار سے ہندی کا قاعدہ خریدا لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت پڑھ گیا تھا۔ فر فر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی مڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگا دین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیا نویسی تجویزیں سنی ان سنی کر دیتا اوروں کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آسیڈیل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرت ہیں تو ہم کا ہے کری۔ اسے طلعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوی رڈیا رڈ کیلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی کے کوی رڈیا رڈ کیلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگا دین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جاں نثار خادم۔ لڑکپن میں وہ سائیکس کی حیثیت سے آیا تھا۔ شہجو کے مرنے کے بعد اسے کو جمپین کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فنن سے

بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدیر کی شیور لے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔
 یہ فٹن بڑے ابا مرحوم کی تھی یعنی بھیا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے
 بعد جب بھیا صاحب گلفشاں میں رہنے کے لیے آئے اور سارے ساز سامون
 کے ساتھ فٹن مع گنگا دین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پٹرول راشن شروع ہوئی تو دفعتاً
 گنگا دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدیر کو طعنے دیا کرتے، چلاؤ نا اپنی موٹر
 یا۔ ہمیں دیکھو۔ ہٹلر کا کھٹکانہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندنا تے ہیں۔

گنگا دین بھیا صاحب کا رفیق خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لیے
 زیادہ تھی کیونکہ وہ بہر حال ان کے مرحوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں
 آیا تھا۔ اکثر بڑے سرکار کو یاد کر کے روتا۔ اپنی اور بھیا صاحب کے بیاہ کے سلسلے
 میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا کیونکہ گو دنیا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہئے
 لیکن بھیا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیر کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور مرنجان مرنج فلسفی قسم کے انسان
 تھے۔ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی مفصل سوالات کا صرف
 جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی نہایت وضع دار آدمی تھے۔ بگلی تک کا
 ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آگئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب، دودھ
 ابھی انہوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ گئیں۔

سنہ چالیس کے دسمبر میں طلعت کو جو نیر کی مہرج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونہ ہو گیا۔ روتے روتے اس نے برا حال کر لیا ہمارا ایک سال برباد کیا، ہمارا ایک سال برباد کیا کی رٹ گلائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ کمال اس کے لئے کہیں سے ایک پروجیکٹر اٹھا لایا، وہ نوابوں کی طرح تنکے کے سہارے بیٹھ جاتی اور دس سال پہلے کی خاموش فلمیں ملاحظہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتوں کے سائے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ روڈ ولف ویلینو، ڈگلس فینیکس، گلو ریا سوان سن۔ دودس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلو چنا گھوڑے کی سواری کرتی اور ای بلی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اپنی کی سہیلیاں سہلتی ہوئی آ جاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر کہیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسمارٹ، باوقار اور سنجیدہ لڑکیاں تھیں۔

دن بھر طلعت پلنگ پر لیٹی رہتی یا گنگا دین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اس نے کمال، ہری شنکر، بھیا صاحب اور اپنی کی مہیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مداوا کس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیمار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا ”طلعت___ انتہیت مورکھ کنیا ستی“ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنسکرت بولی۔
 ”کیوں۔“

”مت رو ہے زبہی___ مت رو___“

”کیوں نہ روؤں۔۔۔“

”اس لئے نہ رو کہ تیرے کلیان کی ہم نے دیوستھا کر لی ہے۔۔۔ ہم تیرا داخلہ ٹھووالے اسکول میں کروا رہے ہیں۔ تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لائبریریئر کے نوپاسٹینڈر ڈپٹی گھس گھس کرنے کے بجائے آئی۔ ٹی۔ کالج میں دندنا۔“

”رگھیر ماما کے اسکول میں۔۔۔؟“ طلعت نے سانس روک کر پوچھا۔
”ہاں۔“ ہری شنکر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دوسرے دروازے سے غائب ہو گیا۔

نرملہ کو جب معلوم ہوا کہ طلعت ہائی اسکول کام امتحان دے کر آئی۔ ٹی۔ پہنچا ہی چاہتی ہے تو اس نے مہنا متھ مچا دی۔ لہذا لائبریریئر چھوڑ کر طلعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹٹوالا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔ لال باغ میں بیرو روڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقتوں کا بڑا پھاٹک، برجیاں، شہ نشین، غلام گرد شمس اب تک موجود تھیں۔ اس کے آگے بڑا لان تھا۔ عمارت کے گرد گرد چٹائی کی دیواریں کھڑا کر دی گئی تھیں جن پر نیلے پھولوں کی بلیں چڑھی تھیں، یہ رگھو ماما کا اسکول تھا اور بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور گنی چنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔ برابر کے مکان میں رگھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔ یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کایسٹھ۔ لڑکیاں، شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کے سہریاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور

یہاں زیور علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اسٹاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناٹھ تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضع داریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ موسیٰ، ماما، باجی، دیدی، بھیا۔۔۔ اسی طرح حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔ بعض لڑکیاں بے حد دلچسپ تھیں، مثلاً حمیدہ بانو جو وسط شہر کی ایک زبردست محل سرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ پینا ماتھر کتھک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے یہ بڑے بڑے کپ اٹھالتی تھی۔ مہر آراء ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواص ان کی خاصدان لئے ساتھ رہتی اور پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پنکھا جھلاتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سو پشت سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جھ بند تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھانک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری پکھی تھی۔ اس کے برابر کی برجی میں تنگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھٹی کے گھنٹے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو، جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا، اپنا سر ہلا کو بڑے پراسرار انداز میں کہتی: ”شاہ زمن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی مہری کو بادشاہ کے آدمیوں نے اس زینے پر قتل کیا تھا۔“

”کیوں گپ مارتی ہو۔۔۔“ ”کسم بحث کرتی“ ”اشرف النساء بیگم وہ

جان ہا پکنز والٹرز کی لڑکی؟“

”ہاں وہی۔“

”وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔“

”اپنی ماں سے لڑکر یہاں چلی آئی تھیں۔۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے

“

حمیدہ بانو سے لکھنؤ کی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنؤ کا کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہوگا اور یہ غائب ہو جائے گی۔ طلعت کو یقین تھا کہ بڑی ہو کر حمیدہ بانو، بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

پھر گھنٹہ بجتا اور گھوماما کی بی بی اپنے رسوئی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں۔۔۔ ارے لڑکیو۔۔۔ چلو بانٹی پڑھنے۔۔۔ یہ کانتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سان وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ بی بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ ایس۔ سی۔ ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈلسٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسوئی گھر میں جا گھستیں اور رگھوماما کے لئے کھانا بنانا شروع کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب، جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے، بیمار پڑ گئے۔ رگھوماما نے نرملا سے کہا: ”ذری ہری شکر سے کہہ دینا آ کے اردو فارسی پڑھا جایا کریں۔“ چنانچہ اگلے روز ہری شکر بہت رعب داب

سے کھٹکھارتے ہوئے کلاس میں آئے اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ بنارس یونیورسٹی کے مولوی ہمیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔ لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔ اردو کے گھنٹے میں بسنتی مہری باغ میں آ کر لڑکیوں کو مطلع کرتی _____:

”بیٹا چلئے _____ چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔“

لہذا ایک ماہ تک جب تک انہوں نے اس جامعہ میں درس دیا یہ افیشیل طور پر مولوی ہری شنکر کہلاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بد مزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوٹے۔

صورت حال یہ تھی کہ کانتی دیدی بوٹنی پڑھاتی تھیں۔ ان کی خالہ زاد بہن جو گشیوری دیدی سنسکرت کی استاذ تھیں۔ ماتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبہ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اردو فارسی پڑھا ہی رہے تھے۔ حالات قاو سے باہر اس وقت ہوئے جب مس مونا داس کی شادی لال باغ کے میتھو ڈسٹ چرچ کے آرگنٹ مسٹر جان فضل مسیح سے قرار پائی اور انہوں نے مہینے کی چھٹی لی تو رگھیر ماما نے طلعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے۔ کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پر لطف ثابت ہوئی کہ جب مسر فضل مسیح تنگ آستنیوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے پہنے واپس آ گئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے گھڑونچوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طلعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لئے رگھو ماما کی رسوائی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔ اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں

طلعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسیح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طلعت اپنی اکلوتی نیلی کار چوبی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤنگ گئی کیونکہ اس روز سے پہلے طلعت نے ساری کبھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہو گئی ہے۔

حضرت گن میں انگریزی دکانوں کے درمیان ایک بڑا سا شاہی کے زمانے کا پھاٹک ہے جس کے اندر وسیع احاطے میں سامنے ہی اودھ کے دسویں حکمران امجد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام باڑہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور نحوست برستی ہے۔ اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں۔ ان میں اب نچلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے باغیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائنگ روم ہیں جن میں کانج پیا نور کھے ہیں کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں۔ عیسائی عورتیں نیچے نیچے فرائیڈنگ ساریاں پہنے اپنے باغیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کودتا دیکھتی ہیں۔ یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جینز پہن کر ناچتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دور تھا۔

مقبرہ سال بھرا جاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں

اس میں چہل پہل ہوتی۔ تب زبردست زمانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں۔ امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھڑیوں اور تہہ خانوں میں عیسائی فقیر نیاں رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جنرل اوٹرم نے لکھنؤ پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنالیا گیا تھا اور لارڈ کیتنگ اس میں عبادت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

یہاں سابق مس مونا داس اور موجودہ مسز فضل مسیح نے اپنے چھوٹے سے انتہائی نفاست سے بچے ہوئے ڈرائنگ روم میں اپنی طالبات کو چاء پلائی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ جو وہ راستے میں امین آباد سے خریدتی لائی تھیں، ان کو پیش کیا اور سب نے مل کر انگریزی گانے گائے۔

لامارٹینسر کے خالص یورپین ماحول کے بعد ٹر وال اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ طلعت اور نرملہ اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دو رنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یورپین تہذیب کہا جاسکتا ہے۔ اس طبقے میں بچے bilingual پیدا ہوتے تھے۔ انگریز گورنمنٹوں کے ساتھ ساتھ قصبائی کھلایاں اور انہیں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو کاننٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی داہنوں کی طرح شرماتی تھیں۔ اکثر ان کی شادیاں ان کی خلاف مرض بھی کردی جاتی تھیں۔ یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن انٹر موڈرن نہیں بنے تھے۔ اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی نیو روایات کے بھی بڑی

شدو مد سے پابند۔ ظاہری طور پر انہوں نے مغربیت کا رنگ قبول کر لیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دورا ہے پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ یہ برطانوی نوآبادیاتی سماج تھا جو جاگیردارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح کا دوغلا ماحول ملایا اور انڈونیزیا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور کلکتہ اور بمبئی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یورپ کی مکمل نقالی کرنے لئے تیار نہیں تھے انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستان تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی معاشرے پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب مغرب زدہ کالے صاحب لوگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی رو کو زیادہ تقویت پہنچائی تھی لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پر اچیں سنسکرتی اور اسلامی عہد زریں کا ذکر کر رہے تھے۔ متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آ رہا تھا کہ ہندوستانییت دراصل ہے کیا چیز؟ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان

علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈنڈے مشرقی وسطیٰ سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں، مسلمان غیر ملکی ہیں۔ ”گلفشاں“ کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزا پور کی قمر النساء اور رم دیا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو، تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بہر حال طلعت اور زملا اسی اوپری طبقے کی پروردہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں لامار ٹینئر سے نکل کر رگھو ماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ لامار ٹینئر کی یورپین فضاؤں میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکی جمع ہوتیں۔ کڑا ہی چڑھائی جاتی۔ چٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوئی ساریوں میں لچکا ناٹکا جاتا۔ ڈھولک پر بے اسبے گوری میا گایا جاتا۔ کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے اس خوشی باش خاندان میں بیس بچیس ہندو لڑکیاں تھیں، اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اوڑھ کر آتی تھی۔ اس بٹاش گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ رگھیر ماما کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظریے میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کاستھ تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے فچیاں مار مار کر پڑھایا تھا لہذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ مواکر دیتے۔ بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترک موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے

تھے۔ اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہاتما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔ جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔ کانگریس کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لئے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔ کمال اور ہری شنکر، نرملا اور طلعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئے۔ تم چلو۔ ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے بہت دنوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔ کمال نے کہا۔ یہ ان دونوں کا پرانا وطیرہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئی نہیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے جانے کہاں کہاں جاتے۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہے، حیدر آباد دکن جا رہے ہیں۔ اندرانہرو نے میٹنگ بلائی ہے، الہ آباد کا قصد ہے۔ فلاں دوست کلکتے میں اکیلا بورہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہو آئیں۔

”بنارس سے کہاں جاؤ گے؟“ نرملا نے ہو چھا۔

”ارے ہم سنیا سی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو۔ جدھر منہ اٹھایا نکل گئے۔“ کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔ لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوٹ کیسوں کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ رگھو ما مسافر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

”ایسے بڑے سنیا سی ہی تو ہو۔ گلہ بھگت کہیں کے۔“ نرملا نے ہنس کر کہا۔

”کاشی کی پاٹ شالاؤں میں بڑی منوہر کنیائیں پڑھتی ہیں۔“ شنکر نے آنکھ بند کر کے کہا۔

”شرم کرو بھین۔“ طلعت نے کہا۔ ”یہ سامنے تمہاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی

ہیں، کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسوسناک باتیں کرتے ہیں۔“
ہری شنکر فوراً پلٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا اور نہایت رعب
اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھانے لگا امتحان کے لئے غالب کی کون کون سی غزلیں
پڑھے۔ ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

۳۸

چمپا احمد نے سینٹ کالج کے کلاس روم کے درتچے میں آکر نیچے نظر ڈالی۔ لو
چل رہی تھی۔ دوسرے ک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں امتاس کے
زرد پتے تیرتے پھرتے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع، بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر
میں پڑا تھا۔ جانے بارش کب ہوگی، چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے
لڑکیوں کی ایک توٹلی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے
ڈائس کے اوپر سے مسز اینی سینٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ
بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر
باہر آئی۔ لیا! بھاگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک
برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ
اور لیا! سڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے
پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج، یونیورسٹی، گھر

'جاڑے' گرمیاں، برسات، پھر جاڑے۔ بنارس کا شہر اپنا مکان، محلہ، رشتے
 دار، کتابیں وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی شاعروں کی طرح
 محسوس کرتی تھی، بچوں کی طرح ہنستی یا رنجیدہ ہوتی تھی۔ کائنات کا سارا بوجھ اس
 کے کندھوں پر تھا۔ اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے۔ ماں بھی
 متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیمر نہ تھا، کوئی
 افسانے نہیں تھے، نہ کوئی روایتیں۔ سیدھے سادے لوگ تھے جس طرح کے
 سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد وکالت
 کرتے تھے۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ چمپا کی نہیال بنارس میں تھی، وہیں
 چمپا کے والد پریکٹس کرتے تھے اوسط درجے کی آمدنی تھی۔ ان کے یہاں ٹیلیفون
 نہیں تھا، نہ موٹر کار، نہ فریجڈیر اور وہ لوگ کوٹھی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں
 باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا سارا جہیز تیار رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ پیغام آرہے
 تھے۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ چمپا بی۔ اے پاس کر لے تو اس کا بیاہ کر دیں گے۔
 چمپا نے کسی کانٹ اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں مسوری جا کر رولرا
 سکیٹنگ کرتی تھی۔ اس کی نہیال زیادہ خوشحال تھی، گو وہ بھی مڈل کلاس ملازمت
 پیشہ لوگ تھے۔ چمپا کے ایک ماموں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنؤ میں ہر تے
 تھے جہاں وزیر حسن روڈ پر ان کی کوٹھی تھی۔ چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی
 دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے ایک چچا مراد آبادی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء
 میں لکھنؤ میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور
 چچا دونوں شرکت کے لئے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بنارس آتے

کے والد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مراد آباد تک کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا، کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقتور ہیں۔ چمپا کے والد اظہار خیال کرتے۔

”اے واہ۔ مراد آباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔“ چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

”اجی تم پوریوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی بلا لیں گے۔“ ان کے والد حقے کا کش لگانا جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنیادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں روز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قسم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہا سبھا کا گڑھ تھا اور ہندی اٹھوا ہندوستانی کی تحریک کا صدر مقام۔

اسی بنارس میں بیچ گنگا کھاٹ تھا جہاں کبیر رہے تھے اور یہیں سارنا تھا تھا۔ جہاں شاکیہ منہ گوتم نے دھرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شو پوری تھی۔ شو_____ خدائے مسرت کا شہر۔

چمپا بیسنٹ کالج میں، جو بسنت کالج کہلاتا تھا، سیکنڈ ایر میں تھی۔ اس سال اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور اب اسے از ابلاتھو برن کالج جانا تھا کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے لڑکیوں کی سماجی حیثیت یکنخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ بیٹا تو آئی۔ ٹی۔ میں پڑھیں

گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلاری کی بیٹیاں آئی۔ ٹی میں پڑھت
ہیں۔ چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی۔ ٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں سے آئی۔
سی۔ ایس لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنؤ میں رہتے تھے
اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے۔

چمپا کالج سے لوٹ کر آتی تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر جو چھت پر
تھا، افق تک پھیلے ہوئے سوالوں کے کلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی ناول پڑھتی، وہ
جین آسٹن پر عاشق تھی اور قرون وسطیٰ پر اور انیسویں صدی کے کیٹس اور روزٹی
وغیر۔ جب وہ یونیورسٹی لائبریری میں امیندرنا تھ یگور اور نند لال بوس کی تصاویر
دیکھتی تو اسے بے حد اچھا لگتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رو
میسفک روح تھی۔

لیا! بھارگوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی۔ یہاں بھی امتحان امتحان کا ماحول ہر
طرف طاری تھا گہما گہمی، چہل پہل۔ کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان۔
یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں سب اسی کی دنیا کے باسی
تھے۔ مجمعے میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی۔ ہجوم اس کے ساتھ ہے۔ ہجوم اس کی
حفاظت کرے گا۔ یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے۔ یونیورسٹی کے مختلف
کالجوں کی طالبات، لیکچرار لڑکیاں، مدراسی اور بناگلی بوڑھے پروفیسر، مہراشر کی
سائنس دان خواتین، سنسکرت اور اور فارسی کے عالم فاضل۔ یہ سب جو تیزی سے
اور مصروفیت سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔ علم میں تعصب
کس طرح داغ ہوتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ تعصب اور نفرت اور تنگ نظری،

شکوہ اور ہٹ دھرمی، ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے اور یہ شورش کے دل کی اندرونی خاموشی میں مغل ہوتا ہے تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہائی سکول کا میوزک کاپرچہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرح طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہیں لڑکیوں میں تیز و طرار اور بٹاش لڑکیوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ چمپا اور لیلیا مسز چٹنا منی دیگر سے باتیں کرنے مصرف رہیں جو ان کی ہسٹری کی استناد تھیں سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ ہندو لڑکے اور لڑکیاں فاؤنٹین پن اور کتابیں سنبھالے آتے، دیوی کے سامنے سر جھکا کر دعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتنے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے ٹکنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اچھلتی کودتی میڑھیوں پر سے اتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک سورداس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی ان کو بتلا رہی تھیں کہ تھیوری کے پرچے میں انہوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فراق پہنے تھیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتنے دونو جوان لڑکے، جو شکل و صورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے، مجمعے میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگر اسٹیٹ کی ایک کار آن کر رکی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کار دھول اڑاتی ہوئی نظروں سے

اوجھل ہو گئی۔

لکھنؤ سے آئی ہوئی لڑکیوں میں ایک لیا! بھارگوا کو پہچانتی تھی۔ اس نے قریب آن کر کہا: ”نمستے“ لیا! دیدی۔ ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ ضرور آئیے گا۔“

”نمستے بیٹا۔ یہ چمپا ہیں۔“

اس نے دوبارہ نمستے کیا۔ ”آپ بھی آئیے گا چمپا دیدی۔“
”ضرور“

”تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔ تم سب کے ناچ گانے کی اتنی دھوم سنی ہے۔ خالی پارٹی دے رہی ہو۔ تمہارا ناچ نہیں دیکھیں گے۔“
”چمپا نے پوچھا۔“

”چمپا دیدی کاشی اور لکھنؤ کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں۔“ ایک اور لڑکی نے قریب آ کر کہا۔

”اچھا، یہ بات ہے۔“ بیٹا ماتھر نے جواب دیا۔ ”تو پھر ہو جائے فیصلہ۔ کہا کی بھیرویں بہتر ہے، کہاں کا داورا، کہاں کا کتھک چلئے آئیے میدان میں۔“
”رہی۔؟“

”رہی۔“

اب ان کے آس پاس لڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔ بنارس کی لڑکیاں لکھنؤ والیوں پر چوٹیں کر رہی تھیں، مگر لکھنؤ والوں سے باتوں میں کون جیت سکتا تھا؟ وہیں طے کیا گیا کہ بسنت کالج میں ان لوگوں کو بنارس کا کتھک دکھایا جائے گا مگر اس سے

پہلے وہ سب لکھنؤ کی لڑکیوں کے ہوٹل پر دھاوا کریں گی۔

ان سب خوشدلی کی باتوں کے بعد چمپا اور لیلیا پھرتا ننگے پر بیٹھیں اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

۳۹

بنارس پہنچ کر طلعت اور نرملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر ٹھہری تھیں وہ ایسی عجیب و غریب جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمید بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے)۔ یہاں پر یقیناً اس کی ہیروئن رہے گی یا ہیرو اس کی چھت پر سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوگا، وغیرہ۔ اور اس جگہ پر ایک ایسی ناقابل بیان دنیا آباد ہو گئی تھی جس کی طرح ناقابل بیان دنیا وسیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاز پر متضاد راستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگ سرخ کا سہ منزلہ محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگریس ورکر تھیں اور مستقل یا تراؤں پر جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنگن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیارے اور کوٹھڑیاں اور صحنچیاں اور تہ خانے اور شہ نشین اور ان گنت طاق اور طاقے۔ مالکہ مکان نے جن کو سب پنڈ

تائن صاحب کہتے تھے، فخر یہ بتلایا کہ جب سلطان عالم قید فرنگ کے عالم میں لکھنؤ سے کلکتے لے جائے جا رہے تھے تو مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بصد تکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سن کر حمید بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈت تائن کو سلطان عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈت تائن سے حمید بانو کی خوب گٹھی، وہ خود بھی بربان ہندی افسانے لکھتی تھی مگر لڑکیوں کی آمد کے تیسرے روز ہی وہ ایک اور یاترا کے لیے جگن ناتھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی کنجیاں بھی لڑکیوں بھی لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ اپنی قیمتی بناری ساریاں انہوں نے لڑکیوں کو زبردستی تحفے میں دیں۔ صبح شام تک اس قدر خاطر داری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں پنڈت تائن اگر ایسی عجیب و غریب نہ ہوتیں تو بات نہ بنتی۔ اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہیے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی راتیں ٹھہری ہوئی ہیں (محل کا نام ”چندن نوا“ تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں آنگن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جا رہا ہے، کسی شہ نشین میں التالیٹ کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری ہو رہی ہے۔ موسیقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگانے کی آوازیں آتیں۔ رگھو ماما ذمے داری کے شدید احساس کے ساتھ ادھر ادھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھرتے پھر ہڑونگے پن میں لگ گئیں، جائے پڑھنے۔ کھانے کے لیے دسترخوان بچتا تو برہمن رسوینا، جو بے انتہا

موٹا تھا، ہنکارا بھرتا اندر آتا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسٹنٹ سویا دہی کی باٹی اٹھائے ہوتا۔ پتیل کی ایک بڑی سی ڈوئی میں وہی بھر بھر کر چیف سویا لڑکیوں کی پلیٹوں پر بہت بلندی سے دہی ٹپکاتا، پھر تھالیوں اور کٹوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔ رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمتی۔ جب امتحان شروع ہوئے تو ہر روز پرچے کرنے جاتے وقت جب لڑکیاں محل کے صدر دروازے سے نکلتیں وہاں کانٹی دیدی دہی اور ماش تیل لیے کھڑی ماتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری باری دہی مچھلی کا شگون کرواتیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ میرس کالج کا سیکنڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہر حال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور ممتحن حضرات میں نارائن راؤ دیا شامل تھے جن کا نام سن کر ہی ڈر کے مارے جان نکلتی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی اداس عمارت کی چھت پر دو کمرے بنے تھے۔ ایک میں نارائن راؤ دیا س بیٹھے تھے۔ لڑکیاں چھت کی منڈیروں کے سائے میں کھڑی جلدی جلدی مشکل راگوں کو نیچی آواز میں دہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک ممتحن اس قدر خفا معلوم ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کچھ چبا جائیں گے۔ کم سکینہ گھبرا گھبرا کر بٹول کے سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈیر پر ایک چیل آنکھیں نیم وا کیے غنودگی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر وہ چیل سارنا تھ کی طرف اڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روز کمال اور ہری شکر آن دھمکے۔
 طلعت اور نرملہ پرچہ کر کے شامیانے سے باہر نکلیں تو انہوں نے سرسوتی کے مندر
 کے نیچے دو لڑکیوں کو مسز ویسکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کے قریب ہی
 سے کہیں سے کمال اور ہری شکر نمودار ہوئے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کی بہت
 پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں
 لڑکے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے جو طلعت اور کمال کے
 قرابت دار تھے، پھر تیز دھوپ میں دریا پار کر کے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور ”پالش
 کی ہوئی سڑکوں“ پر سے گزرتے ہوئے طلعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن
 میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

”مجھے قمرن کے لیے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔“ طلعت نے با آواز
 بلند کہا۔

”ابھی تمہاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی۔“ کمال نے پیچھے مڑ کر
 پوچھا۔

”نہیں۔ پیسے لاؤ۔“

اب دونوں لڑکوں نے غرا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

”تمہارا خیال ہے ہم مہاجن ہیں۔ کوٹھی چلتی ہے ہماری؟“ کمال نے غصے
 سے کہا۔

”ہم تو دو مفلس فلاش برہمچاری و دیار تھی ہیں۔ خود دان پن پر گزر کرتے
 ہیں۔“ ہری شکر نے کہا۔

”لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔“ کمال نے کہا۔

”صحیح کہتے ہو۔“ ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صا د کیا۔

”اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندر روپ وتی کون ہے جو سر سوتی کے مندر کے سائے میں کھڑی تھی تو بنارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔“ کمال نے کہا۔

”کون مہا سندر روپ وی۔“ طلعت اور زملانے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟“ کمال نے مایوسی سے پوچھا۔

”بالکل نہیں، مگر پیسے لاؤ۔“

”اگر تم اس کا پتا چلا دو۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”بھین تمہارے لیے تو لڑکیوں کے پتے چلاتے چلاتے ناک میں دم آ گیا ہے۔“ زملانے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھ دار تھی چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رام نگر پہنچے اور دن بھر خس کی ٹیٹوں کے پیچھے بیٹھ کر انہوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے کہیں ہانکیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کاشی کی بہت سی رئیس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت ہنسا ش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانتی دیدی کی قیادت میں ان کے غول کے غول گلی کو چوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کی دکانوں کی دکانوں کے سامنے یہ لوگ دھڑنا دے کر بیٹھ رہیں۔ انہوں نے ان

گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔ شام پڑے کشتیوں میں بیٹھ کر جب وہ گنگا کے دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں حمید بانو موقع محل کی مناسبت سے پاٹ دار آواز میں۔ اے آب رود گنگا_____ والی نظم شروع کر دیتی۔ سب لڑکیاں مل کر اسے اٹھاتیں۔ انہوں نے شہر میں جا کر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام ”خزانچی“ تھا، پھر ایک روز بھری دوپہر یا میں وہ سب سارنا تھ پہنچے۔ جہاں کے ایک معبد کے مرمریں فرش پر دیوؤں کی روشنی رقصاں تھی اور ایوان میں چھوٹے بڑے سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھارتھ کے رکھے تھے اور ماحول کے تقدس سے مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپٹوں اور ساری کے آنچلوں سے سر ڈھانپ لیے اور سب نے بدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انتہا پاکیزہ محسوس کیا۔

”یہاں کس قدر سکون ہے۔“ طلعت نے کہا، وہ سب ہال میں دیوار سے ٹک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

”ہاں آں۔“ حمید بانو نے سر ہلایا، پھر وہ بڑے پراسرار طریقے سے مسکرائی۔ گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

”بات یہ ہے۔“ اس نے کہا، ”کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہاں آ کر بیٹھے ہیں اس لیے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا ہے۔“ طلعت کو حمید بانو کی یہ حقیقت پسندی بہت کھلی۔

”مگر یہ واقعہ ہے کہ مہا متا بدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔“ طلعت نے سوچ کر کہا۔

”اجی تم کی اجانو یہ باتیں۔“ حمید بانو نے بزرگی سے کہا، ”دراصل ہم

مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔“ پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی، وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑا رومان پرست تھی مگر اس ذہنی کش مکش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی الفت کس واسطے ہے۔ دیر و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معاً طاعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کیا، پھر مینا ماتھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب لڑکیاں گھیرا باندھے مانچ رہی تھیں اور ان سب میں حمید بانو پیش پیش تھی۔ دو جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیر زرجسٹر کھولے بیٹھے تھے ذرا اچھنبے سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سائے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ ازم کی تاریخ پر کمال کو ایک لیکچر دے رہا تھا اور کمال نے قریب کے ایک ستوپ کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لُٹلے کے لیے چکر سا آ گیا، پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنٹ اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علیست سے بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سرخ ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں ستوپ کھڑے تپ رہے تھے اور ایک راستہ چکر کا تانچے سے اوپر جاتا تھا اور ستوپ کے چاروں طرف گھوم کر وہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ کمال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب لڑکیاں باہر آ چکی تھیں اور حمید بانو قریب سے کانفی دیدی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی: میں خواب میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آچکی ہوں میں نے یہ سرخ ریت والا تپتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے۔

گڈ اولڈ حمید بانو _____ کمال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور افسانہ نگاہ بن جائے گی اور روحانیت میں دلچسپی لے گی اور شاید تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔

”حمید بانو _____ ظہر کا وقت ہے، چلو نماز پڑھ لیں۔“ رفیعہ باجی نے ستوپ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے آواز دی اور حمید بانو ہڑبڑا کر سرخ ریت والے راستے پر سے اتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے سستانے کے لیے جا بیٹھی تھیں۔

کمال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوپ اور میوزیم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان سنہرا گھنٹہ دور سے نظر آرہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر لرزاں تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا، وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

”چار بج رہے ہوں گے _____“ گھبیرا ماما نے پھانک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ”اب واپس چلنا چاہیے۔“

”چلو لڑکیو“ کانٹی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنؤ واپس جانے کے دن قریب آئے اور روانگی سے ایک روز قبل چند دن
نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اسٹیج بنا اور اسے کیلے کے پتوں سے
سجایا گیا۔ محل کے وسیع لُق و دق ایں ٹوں کے فرش والے صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور
بڑی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور اگلے دالان میں
جام ناگ کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے پیچھے ساز رکھے تھے اور پینا ماتھر میوزک
ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سر یواستوا جلدی جلدی سب رکھے تھے اور پینا
ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سر یواستوا جلدی جلدی سب
باجوں کے سر ٹھیک کر وارہے تھے۔ باقاعدہ ڈراما کرنے کی کسے فرصت تھی۔ وقت
کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہوگا۔ یہ اس لیے کہ اس میں زیادہ ڈرامیلا
گ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ سارا کام میرا کے بھجوں کے ذریعے چل سکتا تھا اور
لڑکیاں ایسی ماہر فن تھیں کہ اسٹیج پر ادھر سے ادھر چلتی رہی۔ طلعت جنرل رول ادا
کر رہی تھی۔ جہاں ایکڑوں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ ایک سین میں
وہ اکبر اعظم کی وزیر بنی۔ دوسرے میں میرا کی سہیلی۔ تیسرے میں جہاں میرا سے
رانا کی شادی ہوتی ہے وہاں جلدی سے اکبر اعظم کی مونچھیں مستعار لے کر وہ
پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جا کر اڑنگ بڑنگ اوم سوہا کہا کہ اس نے میرا بانی کی
شادی کرادی۔

پھر بہت سی لڑکیاں اس لیا کے ناچ کے لیے چھن چھن کرتی آئیں۔ انہوں
نے دنیا بھر کے زیور پن رکھے تھے۔ حد یہ کہ رفیعہ باجی جیسی موٹی خاتون بھی ماتھے

پرنقڑنی بوسجا کر مٹھرا کی گوالن بنی تھیں۔ حمید بانو نقلی موتیوں اور پٹیوں کا مکٹ پہنے
بڑے اسٹائل سے بانسری اٹھائے کھڑی رہی۔ نرملا ستار سنبھالے والان کے پیچھے
سے گویا بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی تھیں۔

سامنے آڈینس تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت
سے لوگ بیٹھے تھے۔ جانے کون کون۔ بسنت کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، لیکچر
اور پروفیسر صاحبان، بہت سے لڑکے، ان ہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور
لیلا بھارگوا بیٹھی تھیں۔ ہری شنکر اور کمال چاندنی کے فرش پر براجمان تھے۔ رگھو ماما
ٹک کر ڈراما دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔

چمپا اور کمال اور ہری شنکر تینوں اس سے الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشا
دیکھا کیے۔

لڑکیاں اس سے دنیا مافیہا سے خبر صرف اس اسٹیج پہ موجود تھیں اور بے حد خوش
تھیں۔

لڑکیاں سوانگ رچنے کے بے حد شوقین ہوتی ہیں۔ بچپن میں وہ پلنگ کھڑے
کر کے ان پر پلنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر، کھیلاتی ہیں۔ گھروندا سجا کر تصور
کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے۔ ہنڈ کلیا ان کے نزدیک بڑا اہم دعوتی کھانا ہوتا
ہے۔ گڑیاں گڈے ان کے لیے جاندار انسان ہیں۔ جب ذرا بڑی ہو جاتی ہیں تو
اپنا بناؤ سنگھار کر کے کس قدر مسرور ہوتی ہیں۔ باہر جانے سے پہلے گھنٹہ پھر آئینے
کے سامنے صرف کریں گی۔ جوتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لیے آفاقی اہمیت
کا حامل ہے۔ بچنا، بہروپ بھرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ رادھا اور کرشن کا

ناج ناجتی ہیں تو تصور کرتی ہیں کہ واقع درندابن میں موجود ہیں۔ ساری عمران کی اپنی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بسا کروہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پجارن یا کنیز کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔ اول دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں جو ان کی رنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ، بھائی، شوہر، خدا، بھگوان، کرشن، بیٹے، پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ جب رنگ بھوم کا ڈائریکٹران سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو دل کی ملکہ ہو، دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو، روپ و تی ہو تو یہ بے چاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ گپ۔ بکواس۔ یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔ کتنی ہی ووان بن جائیں، کتنی ہی ووان بن جائیں، کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہوا، ان کی اوقات وہی رہے گی۔ پجارن۔ کنیز۔

لاحول ولا قوۃ

کمال راس لیا دیکھتا رہا۔ سامنے گویاں اب کرشن کی آرتی اتار رہی تھیں۔
 دالان میں نرملا اور بینا ماتھر زور زور سے گاتی رہیں:

”موہن سنادے میٹھی تان۔ مدھر رس بھری، رسیلی، پیاری پریم کی تان۔“

واہ۔۔۔ کیاباات ہے۔

اری مور کھڑکیو تم کو خبر بھی ہے پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے۔ کبیر

میں جا بیٹھی۔ باہر گلی بی سنسان پڑی تھی۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈیو اکٹھے بچ رہے تھے۔ لکھنؤ سے خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی موکل کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

”ڈاک میں تمہارا یہ لفافہ آوا رہا۔“ اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چپٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس نے خط کھولا، پھر برآمدے کی بتی جلا کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ اجنبی زنانہ لکھائی تھی اور کسی اجنبی کا خط تھا۔ مسوری سے آیا تھا اور انگریزی میں تھا اور مائی ڈیر چمپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آرہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا، اگر وہ فلاں فلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے فلاں فلاں کلب خوش آمدید کہیں گے، اگر وہ آؤٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائریکٹر جے مالا اپا سوامی سے اسے ملنا چاہیے۔ ٹینس کی سیکرٹری لیلا شرما ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بے حد خوش ہوگی، اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے۔ ڈراما گلداس کی اداکارہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کی خواہش مند ہے (اگر اسے ایجنج سے دلچسپی ہے) وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوسٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکلٹی کے متعلق۔ اخیر میں لکھا تھا کی نئی لڑکی کی حیثیت سے مکتوب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کی وہ آفیشل ایڈوائزر ہے۔ لہذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچے تو اسے راقم

الحروف فلورنس نکلسن ہال کی سیڑھیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پرابلز کا حل تلاش کرے گی۔

نیچے راقم الحروف کا نام لکھا تھا تہینہ رضا، تا راہال، مسوری۔

چمپا ہکا بکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہینہ رضا کون ہے اور اسے میرا پتا کس طرح معلوم ہوا اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی معلوم ہوا، یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے لگا وہ اب بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب و غریب دنیا کی طرح سفر کرنے والی ہے۔ اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتے بعد سب آ کر بار ملنے کے لئے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم کھلوایا گیا۔ لارڈ مہری سب کی خاطر سر کرتی آگے پیچھے دوڑتی رہی۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہو گئیں، جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہوں۔ ان میں سے بڑا لڑکیاں سوچ رہی تھیں، اب جانے ہمارا کیا حشر ہو گا۔ ان میں سے اکثر کی شادی ہونے والی تھی۔ چند کو ابھی کالج میں پڑھنا تھا۔ دفعتاً جمید بانو نے، جو بے حد ڈریسٹیک واقع ہوئی تھی، مس پر دھان کی نئی فلم کا گانا شروع کر دیا: ہنس لے جی بھر بھر کر ہنس لے۔ جانے کون کہاں پھر جائے۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا

گایا گیا: رک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ _____ اور اس کے بعد تیسرا _____ اور
 جینے والے ہنستے ہنستے جینا۔ سورج کبھی نہ ڈوبے تیرا _____ وغیرہ۔ یہ سب
 گانے کی وجہ سے خوب رقت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب چمکو پہکو روئیں۔
 واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ ساری لڑکیوں
 کو طاعت نے عمر بھر نہ دیکھا، وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جو اتنی اچھی
 بھولیاں تھیں۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ
 الگ الگ ہو جائیں گے، اور جب بچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ
 تھے۔

۴۲

ہندوستان کا بہترین گریلز کالج _____!

از ابلاتھو برن _____!!

”چاند باغ۔“!!!

لکھنؤ کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا پھاٹک ہے اور بہت دور ہی سے ایک
 بے حد طویل و عریض دو منزلہ عمارت نظر آ جاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند و
 بالا پورٹیکو کے ستون دور سے دکھائی پڑتے ہیں۔ اس پورٹیکو کا فرش مرمری ہے۔

سامنے لامن پر پام کے درخت لگے ہیں۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف
 شیشوں والے طویل اور بڑے بڑے درتھے ہیں اور جھلملاتے ہوئے فرش اور
 چوڑے مرمریں زینے۔ اونچی چھتوں میں جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ اس
 کا 'براؤزنگ روم' جہاں لڑکیاں بیٹھ کر فرصت کے وقت میں علم چرتی چکاتی ہیں،
 اپنی آرائش کی وجہ سے کسی برطانوی لارڈ کا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں
 بیش قیمت نوادرجے ہیں اور نایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگوں سے اس کی
 دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہیں۔ یہ عمارت
 ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں وسیع کیسپس پر دور دور فاصلے پر
 اتنی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے
 شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر پھولوں کی خوبصورت بلیں
 پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کئی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوٹل
 ہیں جو نشاط محل، نونہال منزل اور میلتری بھون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار
 ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیسٹ ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکلٹی
 کی ہے جنہوں نے اپنے کمرے اور سیننگ روم دلہن کی طرح سجا رکھیت ہیں۔
 کیسپس کے وسط میں ڈائننگ ہال کی عمارات ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے
 جس کی انچارج ایک نگرورنس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو
 موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلے
 فورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بے انتہا اسٹریملائنڈ جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا
 سے لو لگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یسوع بھی کسی امریکن یونیورسٹی

کے پریذیڈنٹ یا نیواگلینڈ کے رحمل اور خلیق پروفیسر ہیں۔ اس کالج کی عمارات کا طرز تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ _____ !!

پورنماشی کی راتوں میں جب چاندنی کیسپس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے سبزہ زار۔ پھولوں کے کنج سفید کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن درتے۔ اس وقت کیمپ کے مختلف گوشوں سے موسیقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔ پتھوون۔ شوپاں۔ ویبر۔ جارج گریشوں۔ یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔ نیگرو نرس ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت لحم کا اکیلا ستارہ کھرے میں چھپا جھلملا رہا ہے۔ چپیل میں سے برقی آرگن کی گہری گونجتی ہوئی آواز اوپر اٹھتی ہے۔ اندر قربان گاہ یک اوپر منقش لیمپ جلتا رہتا ہے۔ سنائے کے سارے پرتو قوس قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔ سو اسو سال ادھر یہاں رہنا تھا۔ یہاں کے باغات میں ہرن کلیلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں اور اودھ پوری کے حکمرانوں کے بجرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اونچی سوسائٹی یہاں آن کر مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتی تھی وہ پرانا برگد کا درخت جو کیسپس کے اس کونے میں کھڑا ہے اس کی پتیاں اس سے بھی پچھلے پہر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔ ۱۸۶۲ء میں جو خوش بارش نو جوان لڑکیاں لمبی آستینوں کے بلاوز پہنے اور گاؤں کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لے کر گاتی گنگناتی آئی تھیں آج وہ مانیاں دادیاں ہیں یا دنیا کے بہت سے دکھانہوں نے اٹھائے ہیں یا بڑی معمولی عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لئے بے چاری لڑکیو تم جو ہال میں گھس یو جیس اونیل کی ریہرسل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کل تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصہ لینے کے لیے تم یہاں سے نکلو گی اس کے محاذ پر کام آنے والوں کے لئے کوئی پیتل کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چپیل کی سفید سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سوچوں کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریہ کائنات غلط ہے۔ صراط مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرح جانے والی جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لیے بے چاری لڑکیو تم جو پھولوں کے کنج میں گر باناچ رہی ہو چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی رہو (اور چونکہ تم عورت ہو لہذا ملحد مشکل ہی سے ہو گی) یا درکھو کے جب تم چاندنی کی اس دنیا سے باہر چلی جاؤ گی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤ گی۔ دوسرے تمہارے جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہوگا جو تمہارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہو گی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ تم بدل جاؤ گی۔

کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری سوشیولوجی کی چہتی پروفیسر، بگ کے ایسے سفید بالوں والی کمر خمیدہ بڑھیا، جو کھٹ کھٹ کرتی مسکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے؟ ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور فلا ڈلفیا کا گلاب کھاتی تھی؟

یہ سارے جشن، یہ ساری تقریبات، رسوم، تہوار، کارنیول، مورس ڈاننگ کے مقابلے، اسپورٹس کے ہنگامے، یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمہارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کیسپس اس کارگہ شیشہ گری، جسے دنیا کہتے ہیں، ایک بے حد چھوٹا سا ماڈل ہے۔

نشاط محل کے پیچھے ڈچ وضع کے باغ کے برابر سے ایک سایہ دار راستہ سوئمنگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی کا مہینہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی ہوئی ہیں: مرہٹی، کجراتی، بنگالی، مدرسی، اڑیہ، نیپالی، پنجابی، پٹھان، یورپین، افریکن، برمی، سنگھالی، ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہباً یہ لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بودھ اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیرو یہاں موجود نہ ہو۔

اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔

اس انسٹو کریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں

گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔
”ہم دینے کے لیے لیے ہیں۔“ یہاں کا موٹو ہے۔

پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر وہ زور
اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں یوگورجینیائی سنائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا
مشرکہ تہوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں سارے میں
چراغاں کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔

اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔
ان کی ایک ایسی پراسرار دنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہو سکتا۔

۴۳

حسب وعدہ سولہ تاریخ کو تہینہ رضا چمپا احمد فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر
ہلی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے
آگے بڑھ کر پوچھا: ”تم چمپا احمد ہو؟“

”ہاں“

”آؤ میرے ساتھ چلو۔“

اور دوسرے لمحے چمپا چاند باغ کی دنیا میں شامل ہو گئی۔ اس رات ہال میں نئی
لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کے
مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو بریک ان

ہونے میں لگے۔ جیسی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کالج کے دفتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینئر طالبات کو بھیج دیے جاتے ہیں اور موخر الذکر ان کی ایڈوانسز مقرر کی جاتی ہیں۔ کالج میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چند دن خاص سینئر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چمپا کو ملا تھا۔

تہینہ کی بہن طلعت آراء جو فرسٹ ایر میں داخل ہوئی تھی، بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی: ”ارے چمپا باجی، ہم نے تو آپ کو بنارس میں بھی دیکھا تھا۔“
اور نرملا سر یواستوا نے سوچا کہ اب کمین بھیا اور بھین صاحب کی تو پانچوں گلی میں اور سر کڑا ہی میں۔ ان کی دینی تو یہیں آن پہنچی۔
چمپا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گلشن شاہ بھی گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ تہینہ کے بھائی کمال رضانے، جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، بے حد اخلاق اور مودبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور طلعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شکر سر یواستوا اس کے لیے خود چاء کی کشتی اٹھا کر لایا۔

ایک کو تیسرے پہر وہ گلشن شاہ پہنچی۔ تہینہ اور طلعت پچھلے برآمدے کے سائڈ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ پیازار مرچوں کا ٹوکرا نیچے رکھا تھا۔ نرملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے ہاں کوئی دعوت تھی۔
چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے، وہ بھی روایتی ہیرووں والی شان سے۔ ٹینس

ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے، خصوصاً جب تہینہ کی سہیلیاں موجود ہوں کیونکہ تہینہ کے کراؤ ڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ تہینہ کے اصل کامریڈ تو کمال اور ہری شکر تھے۔ مگر بھیا صاحب بہر حال بھیا صاحب تھے۔

چمپا بیٹھی آلو چھلت رہی۔ اس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تہینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے۔ اس سے بات کر کے وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے گنگا دین کو بلایا۔ ”یہ نئی بیٹیا کون ہیں جو اندر بیٹھی ہیں۔“

”پتا نہیں سرکار۔“ گنگا دین ہڑبڑا گیا۔ بھیا صاحب نے آج تک لڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخری بڑی بیٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ ”بڑی بیٹیا کے پاس چاند باگ کی سبے بابا لوگ آوت ہیں۔“

”اچھا جاؤ۔“

کمال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طلعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خائف رہتے تھے، اگر اس سے اشارتاً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے گی۔ کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تہینہ سے آفیشیل طور پر منسوب تھے لہذا دنیا جہان کی کسی اور لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تنہا تھے۔

بھیا صاحب اپنی ذات کے رومانس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو سجاتا نے بتایا: ”یہ مہاشے تہینہ کے فیانسے ہیں مگر تہینہ ان کو مستقل نو
لفٹ کیے رکھتی ہے۔“

اوہ۔ کس قدر پھل صورت حال تھی۔ دو کزن جو ایک دوسرے سے منسوب
تھے۔ گلنشاں کی قسم کے ناموں والی کوجیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے
اس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ افسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ جو دوسروں کی
زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ دراصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسرے پڑھ رہے
ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

۴۴

برسات نکلی۔ کاتک پور نمائی آئی، پھر ماگھ پوس کی ہوائیں چلیں، کمروں میں
آتش دان جلے، باغوں پر کھرہ چھایا، رات کے پھولوں پر شبنم کے قطرے جمے، چاند
باغ میں کرمس کے تہوار کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے
فیشن کے اوور کوٹ سلوائے۔ غریب غریبا پالے میں ٹھٹھر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔
بڑے لوگوں نے شکار کے لیے کاپسی اور ترائی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دوبالا
ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بسنت آئی۔ سروسوں پھولی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ بہار کی
خوشبوؤں کے فضا میں مہکیں۔ انڈرگریجویٹ شعراء نے انگریزی میں جدید طرز
کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تہ خانے آباد ہوئے۔ خس کی ٹٹیاں لگیں۔

اضلاع کے کمپنی باغ چنبیلی کے پھولوں سے مہکے۔ لچبوں کی کھانچیاں اتریں۔
 لوچلی۔ گومتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا۔ امریوں میں جھولے
 پڑے۔ اے لیجے ایک سال نکل گیا۔ عمر عزیز کا ایک سال ختم ہوا۔ اب دیوالی
 آرہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی ٹوکریں برآمدے میں لا کر رکھی گئی ہیں۔ نرملا
 اپنے گھر کے آئین میں رنگوں سے نقش و نگار بنانے میں جٹی ہے۔

طلعت پچھلے برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر لوٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے
 باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلاہٹ سے آنکھیں
 چندھیا گئیں۔ نیلاہٹ جو دور نیچے جا کر درختوں کی ہریالی میں کھجو گئی تھی اور
 شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوٹھی میں مسز ٹیگور کے یہاں طبلہ بج رہا
 تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب وائلن بجا رہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یا
 جوج ماجوج کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیٹی ہوں۔ ٹھنڈک۔ سکون (جو
 سارا ناتھ کے مندر میں بھی ملا تھا) کیا جوج ماجوج تھے۔ یا کون تھے؟ بہر حال۔
 ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ میٹھی تپتیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔
 گمکے جو سیندوری رنگ میں رنگے گئے تھے ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ
 سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آ گیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی
 تیاری کر رہے تھے۔ کمال اور ہری شکر ایم۔ اے۔ فائنل میں آ گئے تھے۔ اپنی نے
 بی۔ اے کر لیا تھا۔ طلعت اور نرملا خود اب سیکنڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ
 سٹری ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کر رہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی

تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شکر کا ان کی تعریفیں کرتی تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکتا، وہ لوگ طلعت سے کہتے: جب تم بڑا ہو جاؤ گی تو تم کو احساس ہو گا کہ چمپا کیسی عجیب و غریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔ اپنی کی ان سے اب بھی ویسی ہی ملاقات تھی۔ اپنی بڑی وضعدار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب و غریب اور قابل قدر ہستی کون تھا۔ اپنی یا چمپا، جی۔۔۔؟ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے، طلعت نے سوچا کہ زیادہ یہ بس ہے ساری بات یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی اتنی بھارت قیمت لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھیا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

کمال ودہرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا کیا، وہ حسب معمول دیوالی کی چھٹیوں میں چکر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لامارٹینر کالج کا ایک جواں سال انگریز پروفیسر، جو چند سال قبل اوکسفرڈ سے آیا تھا، سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے کمال کو بھیجا گیا تھا، کیونکہ کمال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے ہری شکر کے ساتھ ہر دوار کی ساری گھنائیں چھان ماریں، چکراتا اور رشی کیش اور ہری کی پوڑی کے مندر، ہمالیہ کی پہاڑیوں کو خوب کھوجا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی، اب کہ میں جنجال سے نکل

آیا ہوں، مجھے واپس مت لے جاؤ، مجھ پر رحم کرو میاں۔ میں بہت مزے میں ہوں اور کمال نے کہا: ”لکھنؤ میں افواہ ہے کہ یہ پبلٹی حاصل کرنے کا ایک ریکٹ چلایا ہے آپ نے۔“

”بھائی“ وہ ہاتھ جوڑے مصر رہے، ”خدا کے لیے چلے جاؤ بھائی۔“ اور اس کے بعد برہمنوں کی طرح زور سے کھٹکھارتے ہوئے، اپنا گیر و لباس سنبھالتے، ایک چشمے کو پھانگ کر جنگل غائب ہو گئے تھے۔ اب کمال منہ لکائے موہنی روڈ پر چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسب معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

”یار! ہری شنکر۔“ کمال نے کہا۔

”ہاں یار۔“

”یار یہ پروفیسر _____ ہملٹن ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں، خدا کی قسم، اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہا۔“

”آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے یکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے،“ چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

”ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے۔ کہ شاہیں بنانا نہیں آشیانہ۔“ کمال نے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر sloppy ہے۔“

ذرا یہ نام پڑھنا۔۔۔۔۔

”خوابستان“ لاجول والاقوة“

”مگر تم خود بھی کلفشاں اور خیابان میں رہتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”یار کمال۔“

”ہاں یار۔“

”ذرا سوچو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک

سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔“

وہ دونوں ایک پھانک کی پلپا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے

لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تاج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک

صحیح الدماغ انسان سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔

”اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔“

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالین والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام

پڑھتے پھرے۔ ”بستر“ ”دولت خانہ“ ”شیم روک“ ”آشیانہ“ ”راج

محل۔“ کمال کے والد کا مکان خیابان بھی سامنے موجود تھا۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھکلوں کے درختوں کی

مہک سارے میں اڑ ہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھانک کی پلپا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے

رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا
جو تادھارے کے زور سے اچھلتا کودتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے نشاط محل ہوٹل کے سیج ڈرائنگ روم میں آکر روشنی جلانی اور
کتاب کھول کر اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلشن کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھی رہا م اوتا کو ہندی پڑھاتی
رہی۔

انگریز سا دھواطمینان سے ٹانگیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان
پر پڑا سو رہا تھا۔

۴۵

دو سال اور نکل گئے۔ اگست ۴۲ء کا اندولن بھی پرانی بات ہو چکی۔ پنڈت جی
اور مولانا اور سارے نیا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن
سپاہی گھومتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں اینگلو انڈین ویک آئی لڑکیوں کے
پرے شہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بد رہا تھا۔ دیواروں پر سے 'کوئٹ انڈیا' کے
الفاظ مٹتے جا رہے تھے۔ سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلشن کے سید عامر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام
ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے۔ فائنل میں آچکی تھی۔ چمپا
ایم۔ اے پر پولیس میں تھی اور کیلاش ہوٹل میں رہتی تھی۔ طلعت اور زملابڑ دھوم

وصام کی انڈرگریجویٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی جو شہر کا فیشن ایبل اسمارٹ انٹلکچوئل سٹ کہلاتا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشندہ اور کنور پی چو اور گنی کول اور کرن بہادر کاٹجو

اور اکرم و ملیشور اور فیض آباد روڈ کی میراٹنی راجنیش اور راجنیش اور نواد اور راحل بلگرامی اور علی اور بیلمر ریکسٹن سبھی شامل تھے۔ پھر گلنشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتھے بندی تھی۔ چوروں کا ڈننی باورچی خابہ۔ بلیک سفید چہروں کا سمندر چاروں اور ٹھانھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی، کیونکہ آخری تجربے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل قطعاً تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویشن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہ ایکویشن غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔ یہی بات چمپا نے دفعتاً سید عامر رضا سے جو بھیا صاحب کہلاتے تھے، کہی۔

اس روز بھیا صاحب مدراس کے لئے روانہ ہونے والے تھے، وہ اس سے ملنے کی تلاش آئے، وہ اس وقت لاہریری جا رہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: ”میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ میرا تبادلہ مدراس کا ہو گیا ہے۔ تم۔۔۔ تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار

”ہو۔؟“

بھیا صاحب ایک تو یوں بے حد حسین و جمیل تھے، نیوی میں شمولیت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ گویا چارلس بوئیر کو یونیفارم پہنا دیجئے۔

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔ یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سنی۔ ایک آدمی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کر رہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا: ”کمال ہے۔۔۔ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آئی ہوگی۔“

”پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلایا تھا۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔
”میں نے آپ کو کسی باغ باغ کے راستے پر نہیں چلایا۔“
”تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری دوست تہینہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ بالکل صحیح تھا۔ تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔ اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علیحدہ چیز ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ خالص فلسفے اور اخلاق کے اصولوں کا جذبات اور امپلسز سے کوئی ایکویشن نہیں۔ ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔

بھیا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لیے۔ ”تم بھی بے حد معمولی نکلیں۔“ انہوں نے کہا۔

”میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعویٰ کیا تھا۔“ اب وہ بادشاہ باغ کے پھانک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ ”ٹھہریے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آرہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے۔“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”گھر تو ہم میں کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔“ چمپا نے اکتا کر کہا۔ ”اب میں اس سے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے، جو گلفشاں کہلاتا ہے۔ لا حول والا۔ کس قدر بوگس بوگس نام ہے۔ اور وہاں تہینہ موجود ہے۔ واپس جائیے۔“

”تم بے حد معمولی ہو اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمہارے سارے رد عمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر ٹائپ پر لوٹ گئیں۔ تمہارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے۔“

”عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑ رہے ہیں!“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”لہذا یہ نظریہ ثابت ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ، وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے نکل کر لاہور کی سمت روانہ ہو گئی۔“

”گلفشاں پہنچ کر بھیا صاحب تند ہی سے پیکنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسی روز تہینہ ایم اے کا آخری پرچہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں کچھڑیاں پکتی رہی تھیں۔ بڑی بیٹیا نے تعلیم ختم کر لی۔ بھیا صاحب نیوی کے افسر

بن گئے، اب پوسٹنگ پر جا رہے ہیں، اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے۔ لوگو یہ بڑا اندھیر ہے، خالہ بیگم نے کہا، کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود، ٹھیکرے کی مانگ، اور شادی کا کوئی نام نہیں لیتا۔ اسی کو کل جگ کہت ہیں۔“

رات کو بھیا صاحب خاموشی سے موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گنگا دین بھی نظروں سے اتر گیا۔ نوکر چا کر اسے غصے سے دیکھتے۔ بے مروت تھے دنوں جنہ _____ حسینی کی بی بی نے زردہ پھانکتے ہوئے سوسن سے کہا اور اپنی لڑکی کی چٹیاں گوندھنے لگیں۔ (ارے کمبخت چلی بیٹھ۔ انہوں نے لڑکی کو ایک چائٹا سید کیا۔ لڑکی زور زور سے رونے لگی۔)

سارے گھر پر بد مزاجی کا دورہ پڑ گیا۔ نواب فقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے کہا _____ اور بناؤ صاحبزادے کو اپنا بیٹا اور کرو لاؤ۔ زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے۔ دنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی ہوگی جب بچپن کے منگیترنے چھوڑ دیا۔

کمال اور ہری شنکر، تہینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا بنارس لوٹ گئی۔ اب حسب معمول پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا۔ سارے گھر والے منی تال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہری شنکر کو اپنے بردھوے کے لیے مرزا پور جانا تھا۔ اس کے آج دھڑا دھڑ پیغام آرہے تھے۔ کمال اپنی پھوپھی کی دعوت پر مسوری چلا گیا۔

جولائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اترنا شروع ہوئے۔ گلشن شاہ کے دروازے کھلے۔ پروانی میں باغ کے پودے سرمرائے کہ ایک روز اچانک بھیا

صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلنشاں میں ٹھہرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ اماں بیگم کے کمرے میں گئے۔

”مبارک ہو۔ آپ کی بیٹا ایم۔ اے پاس ہو گئیں۔“ انہوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

”میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔“

”کس سے؟“ اماں بیگم نے زرا تلخی سے پوچھا۔

”مجھ سے اور کس سے؟“ انہوں نے بھی اسی تلخی سے جواب دیا۔

”تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ چچا کی بیٹی کو چھوڑ کر غیر لڑکی کے

پھیر میں پڑ گئے۔ ہم جدھر جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔“

”یہ آپ نے کس طرح طے کر لیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں

پال پوس کر اس گھر میں اسی لیے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تمہینہ بیگم کا شوہر

کہلاؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بیٹا کو جل دے جاؤں

گا۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

سوسن نے جا کر تمہینہ سے کہا: ”بیٹا _____ ہم تو امام باندی کو بلانے جا رہے

ہیں، گانے کے لیے۔ کچھ سنا نہیں آپ نے؟“ آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔“

”سوسن _____ تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو

جائے میں ہرگز ہرگز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔“

اتنا کہہ کر تمہینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سوسن ہکا بکارہ گئی۔

گھر میں ایمر جنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے۔ کمال کو مسوری تا رو دیا گیا کہ وہ بہن کو آ کر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے بھر تہینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لڑکی ہو۔ ایم اے۔ پاس ہو تو کیا ہوا؟ اور بڑے گھر کی بیٹیا ہو تو کیا ہوا؟ ہو تو لڑکی۔ شادی کر لو۔ اس کے بغیر گزر نہیں۔ رشتے نا طے کے معاملات میں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی، گو خالص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات رات بھر رویا کرتی۔

چمپا بھی واپس آ چکی تھی۔ یہ اس کا کیتنگ کالج میں آخری سال تھا۔

کمال نے مسوری سے آ کر گھر کا یہ نقشہ دیکھا، پھر وہ چمپا سے ملنے کی تلاش گیا، وہاں معلوم ہوا کہ چمپا ابھی اپنے ماموں کے یہاں ہیں، اگلے ہفتے ہوٹل آئیں گی۔ چمپا کے یہاں پہنچا تو وہاں بھیا صاحب سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی۔ پتا نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے، وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدارس کے لیے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آ گئے۔ تہینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا کیا کرے؟ لڑکیوں کے لیے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں سوائے ایک محکمہ تعلیم کے۔ تنگ آ کر اس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی نبھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور

باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لونڈیاں ہیں کہ جذبات کے چھپھورے پن میں مبتلا ہوں!

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقتی طور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

۴۶

قحط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں کمال کلکتے جانے والا تھا کہ اسے جیجی کا خط ملا۔ لاج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دلی میں تھی جہاں جیجی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمے میں انڈر سیکرٹری تھے۔ اب نرملا کی شادی کی فکریں کی جارہی تھیں۔ جیجی نے لکھا تھا: تم کلکتے جا رہے ہو۔ سردیپ نرائن کا لڑکا گوتم بھی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے، وہ بھی تمہارے بنگال ریلیف اور اپناؤ پٹا کے چکر ہی میں وہاں گیا ہوا ہے یا شاید وشوا بھاریت میں کچھ کر رہا ہے۔ بہر حال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرف خالی بوئیمین ہی ہے۔

کمال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ کمال کے آدمی ہیں جیجی بھی۔ انسان دیس میں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں، ملک تباہی کی اور جا رہا ہے، یہ شادی بیاہ کے قصے

لے کر بیٹھے ہیں۔ (وہ بڑا جوشیلا اسٹوڈنٹ ور کر تھا اور تہمینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے مسئلے سے شدت سے بور ہو چکا تھا) میں کلکتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گا یا نرمل صاحبہ کے لیے دو لہا تلاش کرتا پھروں گا، اس نے جھنجھلا کر طلعت سے کہا، مگر بہر حال فرض کے طور پر اس نے ان صاحبزادے کا پٹا نوٹ کر لیا جو جیجی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔ راستہ بھر یہ لوگ ٹیگور اور نذر الاسلام کے دلولہ انگیز گانے گاتے گئے۔ ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہلہاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا۔ یہ میرا ملک ہے۔۔۔ یہ میرا ملک ہے۔۔۔ وطنیت اور انقلا بیت اور قومی جوش اور برطانوی حکومت کے خلاف غم و غصے کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکیچ چھپے تھے۔ رکھانے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ کمال نے نظریں اٹھا کر دیکھا کو دیکھا وہ رو رہی تھی۔

سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا: یہ جنگ ہے جنگ آزادی
 آزاد کی پرچم کے تلے۔۔۔ ہم ہند کے رہنے والوں کی
 ریل کی چھک چھک گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوئی۔ دوسرے کونے میں
 چند لڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

کمال نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کی۔ اس کے رفقاء اسی طرح
 بچشیں کرتے رہے۔۔۔ ٹرین بہار کے سرسبز علاقوں سے گزرتی بنگال میں

داخل ہو گئی۔

گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلع کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔
لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاروں اورتالاب تھے، اور سبزہ زار،
اور بانس کے جھنڈ۔ دور سورج گنگا کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر دو
پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کا مجمع تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتے
جانے کے لیے ٹرین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل
میں فوجیوں کی ٹرین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی، جو برما جا رہے تھے، اردو کے
فلمی رسالے ہاتھ میں لیے ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی میجر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دو بل ٹیریکٹوں کے ساتھ
فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑے ایک انگریز کرنل سے مصروف گفتگو
تھے۔

”جب تک یہ فوجی ٹرین نہ چلی جائے آپ کی گاڑی روانہ نہیں ہوگی۔“ ایک
گارڈ نے کمال کو بتایا۔

”اس کا مطلب ہے۔“

”جی ہاں۔ کوئی چارپانچ گھنٹے لیٹ ہوگی آپ کی یہ ٹرین۔ یہ وارنائم ہے
جناب۔“

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پر اتر آئے۔

اردھو گوگو نے بوجے مادل۔ انہوں نے نذرالسلام کا ایک اور گیت شروع
کر دیا۔ میجر صاحب کی بیگم صاحبہ دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

”یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی۔“
 ”کمپونٹ ہیں سالے۔“ میجر صا نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ ”چلو۔
 کرنل ہمیں ریستوران کاریں مدعو کر گیا ہے۔“
 وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ریستوراں کار کی سمت چلے گئے۔
 کمال اور اس کے ساتھ اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہ
 لیتی تھی۔

ایک ریکھا چیخ کر ایک طرف دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے
 پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ سہا اور سکڑا ہوا
 بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان، جس کی چھوٹ سی چھدری سیاہ داڑھی تھی، مراہوا پڑا تھا۔
 اس کی بیوی ایک سانولی سلونی دہلی پتلی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس
 کے دنوں بچے، جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی، ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔
 ”کمال۔“ ”تریندر نے آواز دی۔“ ”اُدھر آؤ۔“ ہمارا
 لاشیں اٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہو گیا۔“

سکیوں کے درمیاں اس نے بنگالی میں بتایا کہ وہ اور اس کامیاں ابوالمونشور
 رزق ڈھونڈنے کلکتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔
 آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کے ٹرین میں سے
 پھینکے ہوئے دوسکٹ اور توس کے چند ٹکڑے جو اس نے جمع کیے تھے وہ اپنے بچوں
 کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اس
 نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگوانڈین اسٹیشن ماسٹران کی طرف آیا: ”آپ لوگ ادھر کیا گڑ بڑ مچاتا ہے۔
آج کل روز سو پچاس آدمی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ
ریلوے اسٹیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے۔ بھوکا بنگالی! آپ
کیوں لکڑ کرتا ہے۔“

”یہاں قبرستان کدھر ہے؟“ نریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے
پوچھا۔

”ہم کو معلوم نہیں۔۔۔۔۔ کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبر کھودے گا۔ دیٹ
ازویری فنی۔۔۔!!!“

لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیا اور بازاری کی طرف
چل دیں۔۔۔۔۔ لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی
طرف روانہ ہوئے۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہیب آوازیں
نکالتی، دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ پاس سے گزرا جس میں سکھ
مہجر اور اس کی دلہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انہوں نے
کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد
اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی جس میں کمال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ
کمال کے پاس آیا: ”ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کا فرینڈ
لوگ کدھر گیا۔“

”ہم اب کل صبح ہی جا سکیں گے۔“ کمال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے

ڈبے میں جا کر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس
آن بیٹھا۔ یہ ٹرین بھی چلی گئی اسٹیشن دفعتاً سمنسان ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سر پر اندھیرا تھا۔ گارڈ بہت نیک دل انسان معلوم ہوتا تھا۔
اس نے ایک لائین لاکر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔
کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوائیں بانسو کے جھنڈ میں سائیں سائیں
کرتی رہیں۔ کمال نے اپنے ہولڈال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر
اڑھادی۔ آمنہ بی بی، جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابوالمنشور، جس کی
نیلی چارخاندہ تہمد میں بہت سے پیوند لگے تھے، دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔
کمال اسٹیشن میں اٹھا کر لائین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکیج دیکھنے
لگا۔ اس دیس کے مصور نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی؟ چند قدم پر گنگا بہہ
رہی تھی۔ اس کی لہروں پر ایک اکیلا نوکا چل رہا تھا جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی
بڑی دلدوز آواز میں بھیمیالی گاتا جا رہا تھا جس کے الفاظ کمال کی سمجھ میں اچھی طرح
نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی اونچے پیل
پاہیوں اور جھلملیوں کے برآمدے ولی ضلع کے کلکٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس
سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈیو بج رہا
تھا۔ رات کے سنائے میں ہواؤں پر تیرتی ہوئی بی بی سی کے لائٹ پروگرام کی آواز
یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے آنکھیں
بند کر لیں۔ یہ راہبندرنا تھ اور سروجنی دیوی اور سرت چندر کا دیس تھا ناول نگاروں
اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔ تاریخ کے ابواب، الفاظ، اعداد و شمار، رپورٹیں کانگریس اور مسلم لیگ کے ایڈروں کی تقاریر۔ کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ دین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔ پاکستان _____ تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹو بینک طور پر پاکستان ہو جائے گا _____ یا کیا ہوگا _____ لینن، اسٹالین، گورکی، ڈاکٹر اشرف، سجاد ظہیر، جناح صاحب، مہاتما گاندھی، پنڈت جی _____۔

کمال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلایا گیا لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دولائیں تھیں۔ سارے واقعات اور نظریوں کے سلسلے کی کڑی آکر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمنشور _____ دولائیں۔

دوسرے روز صبح وہ سب پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ شام کو ٹرین ہوڑہ پہنچی۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ پرمود مار کا گھر ان سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو دوسرے روز جمع ہونا تھا۔ کمال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماموں ”نیا برج والے نواب“ رہتے تھے۔

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے پھانک کے سامنے ایک بند گاڑی آن کر رکی۔ اس مکان کا طرز تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں

نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پیل پائے۔ چوڑا برآمدہ۔ برآمدے اور دروازوں پر
 وینشین جھلملیاں۔ اندر کمروں میں مرصع سنہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے
 تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں
 میں چینی پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلامہک رہا تھا۔
 اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی: ”ارے کمن بھیا آگئے لکھنؤ سے۔“
 ”سارے گھر میں شور مچ گیا۔ نوکرانیاں اور نوکر باہر دوڑے۔ نیچے برآمدے میں
 فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لیے آرام
 کرسی سے اٹھے۔

یہ مکان پچاس پچپن سال قبل دت خاندان سے میا برج والے نواب کمال
 رضا بہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خریدا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی
 دھوم دھام سے برہموسماج کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے
 میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹو
 گراف جس میں مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالک مکان بابو منورنجن دت
 کے انتقال کے بعد جو کیننگ کالج لکھنؤ میں پروفیسر تھے ان کی اولاد نے یہ مکان
 فروخت کر کے بالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوائی تھی۔ ان کی اولاد میں اب کئی
 آئی سی ایس افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یورپ میں تعلیم
 حاصل کرتی تھیں۔ بابو منورنجن دت کی ایک پوتی کی شادی اڑیسہ ایک مہاراجہ سے
 ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور دت خاندان کی کئی پشتوں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنؤ کے اجڑے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور

کلکتے میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا مشغلہ زندہ رہنا تھا۔

نواب کمال رضا بہادر سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ میا برج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچا زاد بھائی تھے۔ انیسویں صدی کے اوآخر کا کلکتہ بے حد موڈرن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پریس اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہندو تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ راجہ سریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر دکھا تھا۔ سوامی ودیکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں دیدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سوشل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکہ کے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنؤ اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنؤ میں یہ لوگ کلکتے والے نوب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انہیں لکھنؤ والے کہاں جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے: کلکتہ، پٹنہ (عظیم آباد) اور لکھنؤ۔ اس سے آگے کی دنیا کی انہیں خبر نہیں تھی۔ ان کا سارا وقت لکھنؤ، دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔ وثیقہ کی آمدنی کا درجہ سے بے فکری سے گزر رہی تھی۔ سر پر

برطانیہ کا سایہ سلامت تھا راوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد جو لکھنؤ میں رہتے تھے، سرسید کی نیچری فوج میں جا شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ بھیج دیا۔

نواب علی رضا کے دوسرے داماد پٹنہ کے رہنے والے تھے، وہ بھی بے حد روشن خیال نکلے۔ پٹنہ میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ ان گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیرسٹر بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انہوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنہ والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیرسٹری کے لیے ولایت چلے گئے۔ یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنؤ والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوئے ہی تھے، اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سرسید مسلمانوں کو علیحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر ان کا سرسید سے اختلاف ہو گیا، وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ اب ان کے یہاں لکھنؤ کے گولہ گنج والے مکان میں لالہ بھائیوں کا مجمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ ان گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنا جا رہا تھا۔ ہندو جو سو سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا، اپنے گنجلک مابعد

الطبیعیاتی ذہن اور خالص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد
 میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار
 صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ وہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا
 کمپنی آئی، تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مغلوں کا کاسٹھ منشی
 پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے سو سال سے ہندو
 اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور
 سائنٹیفک نظریہ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر
 کانہوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی، اس کا تدارک کرنے
 کے لئے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو، جنہیں ۱۷۵۷ء کے
 بعد ہر طرح سے کچایا گیا تھا، اب اپنی عنایات سے نوازنا شروع کیا۔ ہندوؤں
 کے یہاں ایک بورژوازی بھی پیدا ہو سکی تھی جو لیڈر شپ اور لبرل سیاست کے
 لیے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹیج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں
 اب تک شہنشاہیت کے تصور موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت
 کا خاتمہ ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انہوں نے سلطان ترکی سے محبت میں
 ڈھونڈا، وہ ان کا خلیفہ تھا جو قسطنطنیہ میں رہتا تھا، پھر حیدر آباد دکن کے نظام سے ان
 کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان
 فرمانروا تھا۔ ان کی لیڈر شپ کے لیے جب ہزبائی نس آغا خاں اور دوسرے
 نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا کیونکہ نام اور خطابات بہر کیف
 عہد رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فیوڈل طبقے کا گٹھ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدنی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے اور مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھ رہے تھے۔ مسلمان جاگیردار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کار تباہ کر دیا گیا۔ اس کی جگہ دوا می بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو ٹڈل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی الٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقع پر انگریز نے ہوا دی۔

وفادار انگریزی خواں مسلمانوں کا ٹڈل کلاس بنا شروع ہوا۔ مسلمان جو لاپا اور کسان جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی فکر تھی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے اور کانگریس نے علی الاعلان سواراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے کھادی کی تحریک اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہو گیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد تھے، جو تعلقہ دار تھے، کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جاں نثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گھ جوں کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سکتا تھا۔ یہ لکھنؤ میں نواب سر ہار کورٹ ٹیلر کا زمانہ تھا۔ اس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں کا سنہرا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قیصر باغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جان عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور ٹھاکر نواب علی اور رائے راجیشور بالی کا لکھنؤ تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابوالکارم تقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آئین سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنی دادی اماں کے ماموں نواب کمال الدین علی رضا بہادر کے نام پر کمال رکھا گیا۔

کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابوالکارم کا خاندان اب الگے وقتوں کا جیسا نہیں تھا۔ اب اس گھرانے کے افراد سرکاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا میاں یعنی بھیا صاحب کے والد بیرسٹر تھے اور کانگریسی لیڈر، مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ کمال کو ترک موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے

ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش و خروش سے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی تو تلی زبان میں قومی نظمیں پڑھتا اور پولیس آکر لٹھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محدود نہیں تھی، روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم وہ تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سیلرز سوٹ کے بجائے پٹنے والی ممانی نے اس کے لیے کھادی کی شيروانی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی ضد کی کہ اسے دلی بھیج دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہر حال کرنل براؤنز دہرہ دون اور لاما رٹینر لکھنؤ کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا؟ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے پرکھ پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں مرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور ستیلا دیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ مٹھ تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا۔ جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی۔ اے پاس مہنت بیٹھا تھا اور جس کو می نے دس کانوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشیر باد دی تھی۔ ہندوستان اٹاوے کی وہ کائی آلود درگاہ تھی جس کی منڈیروں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے جن میں سے ایک نے کمال کو بٹول کے سنترے کھلائے

تھے۔ ہندوستان قدیر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پیلے رنگ کی دھوتی پہنے مرزا پور کے اسٹیشن پر کمال کے لیے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول لائنز کی وہ سڑکیں تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائز شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانسا ماں تھا جو جب کمال کو سیتا نکلی تھی تو، اپنی دو پلی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گر کر کڑا کر بولا تھا۔

”ماتا _____ اب معاف کرو _____ بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ _____ ماتا تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

یہ _____ سویتا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا _____ ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیبیاں بھی ہندوستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال، محاورے، گیت، رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں، جو مغلائں سناتی تھیں: جو دھیا کے رجبہ دھرتھ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا کیکی، دوسری کا کوشیلیا _____ ہندو پرانوں اور دیو مالا کے قصے، مسلمان اولیا کے قصے، مغل بادشاہوں کے قصے۔ یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر، ایک تاسف اپنے حال پر، ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق _____ ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی، جو دھوتی باندھے گھومتے تھے اور ملک کے سنتوں، کبیر اور تلسی داس اور تکارام کی روایت پر پورے اترتے تھے، اس کسان کے لیے سہل تھے جو خود بھی دھوتی

باندھے ننگا گھومتا تھا۔ نہر واس ہندوستان کے نئی نسل کے سہیل تھے جس کی دل میں یہ سارے دریا امنڈ رہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے۔۔۔۔۔ مذہب، فلسفہ، آرٹ، رمزیت، تصوف، ادب، موسیقی۔۔۔۔۔ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا، دوسری طرف انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز لڑکے، جو کرنل براؤنز اور لامارٹینر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر، جو گلفشاں میں ڈنر کھانے آئے تھے، اس کی گولہ گنج والی حویلی کی شہ نشیں میں بیٹھ کر محرم کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ انگریز، ہیلی بری کے افسروں کے جانشین، جن کو سکھایا گیا تھا کہ کن ہندوستانیوں کو جب وہ تمہاری کوٹھی پر سلام کے لیے حاضر ہوں تو برآمدے ہی میں بٹھاؤ، کن کو ڈرائنگ روم میں بلانے کی عزت بخشو، کن کو صرف کھڑے کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو، کن کے گھر خود بھی، جب وہ مدعو کریں، تو چلے جاؤ۔ کمال اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے ملنے کا فخر حاصل تھا۔۔۔۔۔ ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۳۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیو
ڈل عنصر چھایا ہوا ہے، ان کا نچا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن
چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر
مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔
پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایہ دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل

مالک شدت سے رجعت پسند ہیں، وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہذا انہوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مڈل کلاس کی اٹل جنیسا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا کھلتا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھ کی نوا جون نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔

اس نئے باشعور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور الف ایلیوی دیس اسی ملک میں رہتا تھا جس کی جھلک کمال نے حیدر آباد کن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجے مہراجے برطانیہ کے فرزند ان دلہند کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاہدے انہوں نے کیے تھے ان کی بناء پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدر آباد کن مسلمانوں کے لیے خاص جذباتی اہمیت کا مالک تھا۔ ہزار گزرا لکھ بانی نس حضور نظام کی مملکت، تہذیب، شعر و شاعری، نفاست، آداب محفل وغیرہ کا

سلسلہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا پھوتا ہے لہذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر بھی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں، مڈل کلاس لیڈروں، ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتے، احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لیے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں، جہاں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب انہوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا لہذا یہاں مسلمانوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیر نگیں تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخری میں آیا تھا لہذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی، جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولیٰ، قرون وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ، وہیں کاسمان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان، جو کانگریس تحریک کی طرف آرہا تھا، سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ _____ یہ ایک نیا عنصر اب سیاسی منظر پر ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انٹلیجنٹ تھے۔ ساری دنیا اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش تھا۔

پھر ۳۷ء میں جب کمال ابھی لا مارٹینز ہی میں تھا، لکھنؤ میں دو اہم واقعات ہوئے مسلم لیگ کا آل انڈیا سیشن اور کانگریس حکومت کا قیام۔ اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقرئی بارڈر کی ساری اور لمبے لمبے بندے پہنچے ڈانس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔

اسی سال کانگریس نے ۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے نظم و نسق میں شامل ہوئے۔ مسز و جے لکشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساڑی اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے موٹر میں بیٹھی وہ کونسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈ یو اسٹیشن کھلا تو انہوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گومتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ کمال اندھیرا پڑے گلفشاں کی میٹھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ شام کے سنائے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کان میں پہنچتیں۔

ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بچتا۔۔۔۔۔

کایا ایک گھروندا ہے۔ کایا ایک گھروندا ہے۔۔۔۔۔

اسی زمانے میں کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ زراعت، صنعت، تعلیم، بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا، پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے ستر سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشیائیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لیے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے اور اب ان کو پھر یورپین امپیریلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ اب پھر گورنر کاراج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کو تحریک شروع کی۔ زوال فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزادی حکومت قائم کر دی جائے۔ تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پیش کش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کیے گئے۔ ہری شنکر اور کمال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۱۷ اگست ۱۹۴۲ء کو کوئٹہ انڈیا ریزولوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی۔ احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔

دس ہزار ہندوستانی پولیس فائرنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیادت کا سامنا تھا۔ چونتیس لاکھ انسان اب تک فاقے سے
مرچکے تھے۔ چونتیس لاکھ _____ انسان _____

چونتیس لاکھ آمنہ اور ابوالمنصور _____

کمال دوسری صبح جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے بعد چیت پور روڈ سے نکلا اور
پرمودا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

۴۸

پارک سرکس میں پرمودا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔
کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم اپنا کارکن پارٹی کے افراد لکھنوالے بھی سب پہنچ
چکے تھے۔

پرمودا کلکتے کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے
ہال میں بڑی سخت گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔
چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جو پروگرام اسٹیج کیا جانے والا تھا اس کی ریہرسل جاری
تھی کونے میں ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں ٹیگور کی چترنگدا کے گانوں
کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برآمدہ تھا۔ اس میں پرمودا کی
بہن کا اسٹوڈیو تھا جو شانتی نکیتن کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈیو میں ایک لڑکا سفید شمال
اوڑھے ایزل کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری ٹچ لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے

تھا (اور سارے باپوں کی طرح) کہ آئی سی۔ ایس میں بیٹھو وہ خود حکومت برطانیہ کے ٹائٹ تھے اور بڑی چوٹی کے پیرسٹر۔ بچپن میں اسے نینی تال پڑھنے کے لیے بھیجا گیا، پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نیکتن چلو۔ اس نے باپ سے تجویز انابا _____ ہمیں وشوا بھارتی بھیج دیجیے۔ باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیوں میاں صاحبزادے، آرٹسٹ بنو گے۔ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ دنیا کے سارے باپ یہی بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا اس لیے باپ نے ضدی پوری کر دی۔ اب وہ دو سال سے بولپور میں تھا اور وشوا بھارتی کے دوسرے طلب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں کلکتے آیا ہوا تھا۔

”یہ لکھنؤ سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔“ کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا، وہ ہال عبور کر کے اس کونے کی طرف چلا جدھر کمال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جا رہی تھی۔

کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: ”نومشکار“

کمال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہارمونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”آداب عرض۔!“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہو چکی

تھی۔

”گوتم نیلمبر — لڑنے نے اپنا تعارف کرایا۔“

”کمال رضا۔“ اسے اطلاع ملی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا۔ تنگ پانجامہ، کرتا تنہرو واسکٹ اوپر سے کشمیری شمال۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سبھی نوجوانوں کا تھا۔

”میاں کہاں آ پھنسے۔ ان بنگالی بول بول کرنا طلقہ بند کر رکھا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔“

دونوں نے باہر ایک ریسٹوران میں جا کر قہوہ پیا اور پھر واپس آ گئے۔

”آؤ تم کو اپنی تصویر دکھاؤں۔“ گوتم نے ارونا دیدی کے نگار خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”یار تم ہری شنکر سے نہیں ملے“ کمال نے کہا۔

”ہری شنکر کون ہے۔“ گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹسٹوں والے انداز میں سگریٹ ہونٹ میں دبا کر تصویر مکمل کرتا رہا۔

”ہری شنکر — یار ہے میرا۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔“

”کہاں ہے بلاؤ۔“ گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

”گھاس کھا گئے ہو، وہ یہاں نہیں ہے۔ لکھنؤ میں ہے۔ بیمار پڑا ہے بے

چارہ۔“

”تم سب لکھنؤ میں کیوں رہتے ہو۔“ گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مڑتے

ہوئے پوچھا۔

”اور پھر کہاں رہیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔“

”تم نے اس کی ناک غلب بنائی ہے۔“

”ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔“

”ماشاء اللہ کیا جواب دیا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ“

”سگریٹ لو۔“

”کیا تم آرٹسٹ ہو۔“

”اور کیا تمہیں گراس کٹ نظر آتا ہوں۔“

”ارے رے۔ تمہارا ہی ذکر جیجی نے کیا ہے خط میں“

”جیجی _____ وہ کون بزرگ ہیں۔“

”ہماری لاج کے میاں۔“

”تمہاری لاج کون ہے۔“

”حد ہے۔ جیجی تو تم کو جانتے ہیں۔“

”مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔“

”مغالطہ! فائیڈ بھی ہو۔؟“

”ہاں۔ تم نہیں ہو؟“

”ہوں تو سہی۔“

”ٹھیک ہے۔“ گوتم تصویر میں لگا رہا۔

”اگر رہ لیے شانتی نکلتیں میں چارپانچ سال تو شاید لوٹ پیٹ کر آرٹسٹ بن

جاؤ۔ فی الحال تو اس کی کوئی امید ہے نہیں۔“ کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے

ہوئے اظہار خیال کیا۔

”خالی آرٹسٹ۔ ارے میرا ارادہ تو ہے کہ مدارس جا کر رام گوپال سے بھرت ناٹیم بھی سیکھوں گا“ گوتم نے الٹی میٹم دیا۔

”یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہنستے ہنستے لونگ گئیں اور انہوں نے بے انتہا میری ہونٹک کی۔ اصل میں لڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں۔ آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔“

تمہاری بہنیں بھی ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ تمہاری نہیں ہیں۔“

”نہ“

”یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور نرمی کا احساس رہتا ہے۔“

”ہوں“ پھر کیا ہوا۔“

”کیا۔۔۔؟“

”تم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔“

”یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھسٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں۔“

”واقعی۔“

”چند سال گزرے میں سارنا تھ گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے

سوچا کہ یا یہ بدھ ازم میں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔“

”ہوں۔“

”تم پارٹی میں ہو۔“

”پارٹی؟____ نہیں۔ ابھی میں اس قابل نہیں بنا۔ اس کے لیے بڑا پتہ

مارنے کی ضرورت ہے“

”ہاں ٹھیک کہتے ہو____ ویسے تم کوئی ایسے ریویو لیوشنری دکھلائی بھی

نہیں پڑتے۔“ کمال نے کہا۔

گوتم نے غصے سے اسے دیکھا۔

”معلوم ہے مہاتما گاندھی نے تمہارے گرو دیو سے کیا کہا تھا۔ کہ گھر میں

آگ لگی ہے اور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔“ کمال نے کہا۔

گوتم نے برش جھٹک کر رکھا: ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو جی۔ کیا تمہارے

ہری شکر میں بھی تمہارا ہی جتنا بچپنا ہے____؟“

”تم بھیا صاحب سے بھی ملنا۔“ کمال نے اس کی بات کی سنی ان سنی کر کے

کہا۔

”وہ کون ہیں۔“

”میرے چچا زاد بھائی۔“

”وہ بھی بہت قابل ہیں۔“

”ہاں“

”لکھنوی میں رہتے ہیں؟“

”ہاں، مگر آج کل محاذ پر گئے ہوئے ہیں۔“

”لکھنوبڑا بڑا اہل کمال پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔“

”اور کیا“

”چلو فرپو چل کر چاء پیئیں۔“ گوتم نے اٹھ کر تصویر پر کیڑا ڈالتے ہوئے کہا۔

”فرپو۔۔۔ تم سخت بورژوا معلوم ہوتے ہو۔“

”بکومت۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصورات رکھنے کا قائل ہوں۔“ کمال نے کہا۔

”شوٹ۔“

”کلاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ تم پروتاریہ کے مستقبل میں یقین رکھتے ہو۔؟“

”ہاں“

”ہاتھ ملاؤ۔“ انہوں نے ہاتھ ملایا۔

”تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مر جائے گا؟“

”ہاں۔“

انہوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

”تم کو وشواس ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بیخ کنی ہی کر کے دم لو گے۔“

”مجھے تو خیر وشواس ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔“

”تم کو کیسے معلوم۔“ کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اس کی کوئی بہت بڑی

آباد روڈ سوے پتا چلا وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی۔ کیا بے تکام نام تھا۔ اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے۔ جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ یا گاجر منزل _____ اور مولی ہاؤس _____ اسے بے حد ہنسی آئی۔ شاید لوگ سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے ریسووا اٹھایا۔

”ہلو _____ چمپا نے کہا“

”ہلو _____ آداب عرض۔ دیکھیے میرا نام گوتم ہے۔ گوتم نیلمبر _____ اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔“

”آپ ضرور تشریف لائیے۔“ چمپا نے جواب دیا۔ ”اور اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو ذرا تیار ہو کر آئیے گا۔ آج ہم سب تلے بیٹھے ہیں کہ کوئی سوشلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔“

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا مگر اس نے فوراً جواب دیا

”بہت خوب _____ حاضر ہوتا ہوں _____ آپ لوگ بھی تیار رہیے گا۔“

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کر ندی کے رخ برآمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا ”طلعت آراء بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟“

”جی میں ہوں۔ فرمائیے۔“

”دیکھیے مس صاحب کوئی لکھنے بیٹھ۔ جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جاسکتا

ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایسا نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”آپ نے IPTA کی طرف سے جس قدر بوگس ڈرامے کلکتے ہیں
پروڈیوس کیے ہیں ان کا احوال میں بھی کمال کی زبانی سن چکی ہوں۔ میں آپ کو
مارجن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا عرب ڈالیے۔ اتنا ہی وقفہ ہم
آپ کو مرعوب کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جائیے کہ نارمل
رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رعب۔ شروع کیجیے۔ سنا ہے آپ وشوار
بھارتی کو نواز رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔
ہر قسم کا اور یہ سب باری باری فرد افراد اور مجموعی طور پر آپ کو امپریس کرنا چاہیں
گے۔ پہلے آپ اپنے پویشیکل خیالات سے مطلع کیجئے۔۔۔۔۔ ری ایکشنری تو نہیں
ہیں؟ یا مہاسبانی۔۔۔۔۔“

”آپ چیلے بناتے ہیں؟“ نرملا نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ کبھی کبھی بنالیتا ہوں۔“

”گوتم۔۔۔۔۔ آپ کا تخلص ہے؟“ طلعت نے سوال کیا۔

”جی نہیں۔ ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا۔ طلعت بیگم۔ میں پھر کہوں گا۔
آپ ابھی اور پڑھئے اس کے بعد لکھنا شروع کیجیے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک
کمی ہے۔“

”بھیا صاحب نہیں پہنچے۔“ کمال نے کہا ”انہوں نے فون کیا تھا کہ چاء یہیں
پئیں گے۔“

”بھیا صاحب اس وقت۔“ طلعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔

”رائیڈنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اب سوئمنگ سے واپس آتے ہوں گے۔“ مجمع اپنی جگہ پر ذرا نادام ہوا۔

”خدا کی پناہ۔ یہ کون صاحب ہیں۔ کوئی فلم اسٹار ہیں۔ اشوک کمار وغیرہ؟“ گوتم نے سوال کیا۔

”بھیا صاحب _____ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔“ کمال بولا۔

”تعلق داران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کیا آپ سب یہی رائیڈنگ اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں۔ میں دراصل سارے ڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقہ امراء پر عاشق ہوں۔ جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا، اپنے بابا کے ہمراہ۔ تو برٹش لارڈوں کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔ جہاں دور سے کوئی لارڈ نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے انڈرٹیکر بھی وہی لارڈوں والا لباس پہنتے ہیں۔“

”ہم لوگ بھی انڈرٹیکرز ہیں۔“ کمال نے کہا۔

”اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔“ ہری شکر نے کہا۔

”لیکن تمہیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔“ کمال نے دوبارہ کہا ”کیونکہ ہم لوگ

اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔“

”میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔ میرے دل میں بڑی وسعت ہے۔“ اس نے

بڑی تمکنت سے جواب دیا۔

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گروہ بہر حال ہمدرد تھا، کیونکہ خود تنہا تھا۔ ہم کتنے قابل رحم طریقے سے سہارے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گروہ محض ایک اور کردار تھا۔ جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی مجسم شکل انسانی رشتے بڑے نازک، بڑی گنجلک بنیادوں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں، اسی لیے میرا انیس نے کہا تھا: خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم۔ ہر طرف آگینے تھے جوشیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہ شیشہ گری تھی۔ کمال نے اس سے کہا۔۔۔ چمپا باجی چوروں کے ذہنی باورچی خانے میں اپنی اٹھک بیٹھک رکھیے۔ آپ ہمارا گھر رکھائیے، ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجئے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومینک ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی؟ یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا۔ کمال نے کہا ”اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں، مگر آپ نہ لکھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈسپلن آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“

”یہ لیکھک لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟“ چمپا نے پوچھا۔

”متوازن نہ ہوں مگر تخلیق کی Process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ

تلاش کر لیتے ہیں۔“

چمپا باجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجیے۔

”تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔ نہیں کمال، ٹھیک ہے، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں تہمینہ کے ساتھ رہوں گی۔“

”مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجئے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکویشن ہونا چاہیے اگر یہ طے کر لیا تو بس سمجھئے کہ بیڑا پار ہے۔“

”پھر وہی نظریے!“

”اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باجی از خود تجربے نہ کیجیے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق دے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پر ٹہلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوٹل، جہاں وہ ایم۔ اے کے لیے رہ رہی تھی، ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں، جہاں یوکلپٹس اور مولری اور سیمل کے پروقار درخت کھڑے تھے، ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی جس میں مسز وانچورہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سیمنٹ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں، یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں، جو زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھیں، بہت ہوشمند اور سینئر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند

باغ میں بھوون اور راسن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائد اعظم جناح اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائے مار اور اسمتھ کالج کی وضع پر چاند باغ کے ماحول کی تشکیل کی گئی تھی، وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آتیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کی فضاؤں سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہمینہ اور نرملا اور طلعت عموماً اکٹھی وقت گزرتیں۔ ایک روز تہمینہ نے چمپا سے کہا: ”سنو۔ آڈلٹ سطح پر اس مسئلے کو دیکھیں۔ بھیا صاحب دبمہر میں مدارس سے آرہے ہیں۔ اس سال تم ایم۔ اے کر لوگی۔ روحانی طور پر اس قدر مہم پسند اور دلاور بننے کا ارادہ ترک کر کے ان سے شادی کر لو۔“

”بکومت۔“

”بکنے کا اس میں کیا سوال ہے۔“

”تم خود ہی نہ کر لو ان سے شادی۔“

”میں تمہاری پرچھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔“

”بکواس۔“ تہمینہ نے جواب دیا، پھر کچھ دیر بعد بولی: ”علاوہ ازیں بھیا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہئیں۔ مرد اس لائق ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔“

”ظاہر ہے۔“

”زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔“

”ہاں۔“ چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طلعت دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ”خدائی کا شکر ہے ان دونوں کی سمجھ میں بات آگئی۔“ اس نے نرملا سے فون پر کہا۔ نرملا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دسمبر میں لکھنؤ آئے اور چمپا کے سارے نئے نظریے پھر ہوا ہو گئے وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

”وہ گلفشاں والے گلفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔“ ہوٹل میں لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اسی اثنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے محکمے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی۔ (اور لوگوں نے کہا: اپنے باپ کو بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے ترنت ہی اسے نوکری مل گئی۔ بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا تھا)

یہ زمانہ جوان لوگوں نے اکٹھا گزارا، ان سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دور جو ایک بار چلا جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

۵۰

شانتا یہ بڑی پرسکون جگہ ہے۔ جھاڑوں پر کونکلیں بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں جن کے درمیان سے ایک مالینی کڑا بجاتی جا رہی ہے۔ بڑے شائستہ ریٹائرڈ کلکٹروں، اوسط درجے کے زمینداروں اور بیرسٹروں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھات پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں۔ سایہ دار راستوں پر سے لمبے لمبے زرد پھودرختوں سے

نیچے برستے ہیں۔ باریک نازک ٹہنیوں والے درختوں پر بڑے سبک پھول پتے کھلے ہیں جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں۔ اتوار کی صبح کوڑکیاں برمی چھتریاں سنبھالے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر ننگ کرتی ہیں اور شدید آنکھ پھول گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست برآمدے کے سبز جنگلے پر پھیلی ہوئی بیل ٹھنڈے فرش پر ستیل پاٹیاں ایک دیوار کے سہارے سے غلاف میں ملفوف طبورہ رکھا ہے۔ کمروں کے اونچے اونچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلملیاں ہیں۔ چوڑی میٹریاں اونچی کرسی بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں۔ چھتیں ڈاٹ کی ہیں۔ چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اٹالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر استحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی میٹریوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں جہاں میں پیدا ہوا میرا مکان بھی عین عین ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کتھالے کر بیٹھ گیا۔ شاننا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آچکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنارکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سنو۔

نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمپا بیگم۔ اچھا نام ہے، ہے نا۔ کہو شاننا میری رائے سے اتفاق کرو، دیکھو تم اتنی دور ہو، تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو، میری ساتھ ساتھ رہو۔ جب نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں شاننا ہوتی تو فلاں کے لیے یہ کہتی، فلاں کو پسند کرتی، فلاں کا مذاق

اڑاتی۔ شاننا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے اب کیا میں تمہارے جذبہ
مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہو گیا ہوں۔؟ شاننا کاش تم یہاں
ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے ان افیشیل بر دکھوے کے
لیے بلایا گیا تھا۔ نرمل رانی جو بی۔ اے فرما رہی ہیں بجائے اس کے کہ روایتی
لڑکیوں کی طرح کچھ شرماتیں ہارمونیم پر ان سے گانا سنوایا جاتا، انہوں نے مطلق
شرما کر نہیں دیا نہ شاید انہیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میرا رشتہ طے کرنا
چاہتے ہیں۔ بہر حال انہوں نے مجھے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کو باتوں
ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں ڈاکٹر یٹ کریں گی۔
نرمل اور طلعت دونوں انتہائی تیز ذہین لڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے ہر وقت ٹرائی
رہتی ہیں۔

”لکھ لی تقریر“

”نرمل نے برآمدے کے جنگلے کے نیچے سے اچک کر پوچھا۔“

”لکھ رہا ہوں۔“

”دکھائیے۔“

”افواہ _____ بھی اصل میں تقریر نہیں لکھی ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ

شروع کر دیا۔“

”یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں۔“

نہ وہ چین سے نکلے نہ جاپان سے نکلے

نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے
محمد مصطفیٰ نکلے تو عربستان نکلے
محمد مصطفیٰ

کمریمیں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوالی شروع کر رکھی تھی۔

”چائے چل کر قوالی گائیے۔“ نرملا نے دوسرا حکم لگایا۔

گویا سنگھاڑے والی کوٹھی میں آکر ”نہ وہ چین سے نکلے“ گانا اس قدر اہم اور ضرور چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ نہ چین سے نکلے گائے۔ اس نے نرملا کو ادا سی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر خوش ہے۔
”چلو نزل میں آتا ہوں، مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا۔۔۔“

”اپنے بھیا صاحب سے ملو او“

عین اسی وقت اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ برساتی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے، گھبرائے ہوئے، مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سب برآمدے میں آگئے۔

”بڑے نروس طبیعت کے آدمی جان پڑتے ہیں،“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

”لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔“ نرملا

نے جواب دیا۔

”شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفظ لے ہیں۔۔۔“ واہ واہ۔“ ہری شنکر نے

احتجاج کیا۔

”ان کے لاشعور میں کوئی پیچیدہ گی ہے۔“ گوتم نے دوسرا اعلان کیا۔ ہری
شکر نے اسے مکا دکھایا۔

بھیا صاحب مجھے پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کرسی چھوڑ
دی اور فرش پر بیٹھ کر ان کے لیے چاء بنانے لگیں۔

”یہ سلسلہ بھی ہے۔“ گوتم نے دفعتاً بور ہو کر پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔

”بھیا صاحب ناچتے بہت اچھا ہیں۔“ نرملا نے موقع کو سنبھالنا چاہا، یہ تینوں
باقی مجھے سے الگ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے تھے۔

”لاک ناچ یا کلاسیکل۔“ گوتم نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اولڈ وائز کے استاد ہیں۔“ نرملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”تب میں ان کو معاف کر سکتا ہوں۔“ گوتم نے سر ہلا کر کہا، میں بہت کچھ

معاف کر دیتا ہوں، میرا بہت بڑا دل ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شکر زور زور سے نل مچا رہا تھا۔

”افوہ تم لوگ کس قدر کیڑا لگاتے ہو۔“ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

”زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔“ کمال نے گواہ افشانی کی۔

”خوب یعنی؟“

”یہ محض باتوں کا دور ہے۔“

”پھر عمل اور تخلیق کا دور کب آئے گا؟“

”میاں جب سے دنیا بنی ہے اگر پیغمبروں اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے

باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے

ہوتے _____ شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سنتے ہو۔ ایک سے ایسا آنے والا ہے۔ جب تمہارے کان ہماری آواز سننے کو ترس جائیں گے۔“ کمال نے کہا۔

”تم وقت کی ہلاکت خیز کے قائل ہو؟“

”ہاں“

سورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سنہری گنبد کرنوں میں مارنجی نظر آرہے تھے۔ سامنے لہروں پر سے ایک کشتی سکون سے گزر گئی۔

”تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔“ معا گوتم نے کمال سے پوچھا۔

”ہاں“

”یہ سامنے جو ناؤ جا رہی ہے یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔“ گوتم معمولی سی بات کو بے حد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ ہری شنکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیڑھیوں پر جا کر کھڑے ہوئے جو ندی میں اترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر Timeless become کی علامت ہے۔ پتھر وقت کی منجمد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ چوہے کی موت کی طرح یقینی ہے اور اتنا ہی غیر اہم _____ دیدانت لکھا ہے کہ۔

”یہ ندی ہماری زندگیوں کا سہل ہے۔“ ہری شنکر نے اپنے آپ سے کہا۔

”مجھے دریاؤں سے عشق ہے، تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟“ اس نے مڑ کر کمال سے بے حد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں۔“

”میں ندی کے پانی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔“ گوتم نے دوسرا ناؤ
نسمٹ کیا۔

”گوتم! تم کیا بیٹی بورژوا اور مان پرست ہوتے جا رہے ہو۔“ ان کے نزدیک
آکر اکڑوں بیٹھتے ہوئے طلعت نے تشویش سے دریافت کیا۔
”نہیں۔“ وہ چونک اٹھا۔ ”یہ وقت کا سر ہے طلعت آرا بیگم۔“ اس نے انگلی
ہوا میں لہراؤ جواب دیا۔ ”تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔“

پل کے پار بہت دور سے نوبت بننے کی آواز آرہی تھی۔ شام کے سنائے میں
وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔
”آؤ بھوتوں کو ڈھونڈیں“
”آؤ۔“

وہ چاروں لان پر واپس آئے۔

”چمپا بیگم، بھیا صاحب، اپنی۔“ گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو
مخاطب کیا۔ آئے ہم سب چل کر بھوتوں کو ڈھونڈیں۔
وہ خاموشی سے موٹر کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ موٹر اب کاٹھ کے
پل پر سے گزر رہی تھی۔

”ایک موٹر ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔“ عامر رضانے
اپنے آپ سے کہا۔

کمال نے موٹر روک لی۔ ”آئے ژرالہروں کو گنیں۔“ وہ پل کے اونچے چنگلے

پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی اہروں پر رنگ برنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان میں جو لوگ بیٹھے تھے انہوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے: مندیلیس، جواہرات، مالائیں، آب رواں کے دوپٹے، تلواریں، پانچامے۔ جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا پانی جگمگا اٹھا۔

ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو بلانا شروع کیا اور ان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سریلی، مبہم، سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سریلی، ڈراؤنی۔ ساحل پر کتے اور گیدڑ چلا رہے تھے۔ شمشان گھاٹ کی لکڑیاں چر چر رہی تھیں۔ قبروں کے تابوت کے تختے چیرے جا رہے تھے۔

”یہاں سے بھاگو _____ چلو آگے چلیں۔“ چمپا نے کہا، اے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گہرے پانیوں میں سے آرہی ہے۔

”ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ یہ آخری آوازیں ہیں۔“ گوتم نے جواب دیا لکڑیاں چر چر پائیں۔

”میرا سر چکرا رہا ہے، مجھے بھوتوں سے بچاؤ۔“ عامر رضا نے پل کے جنگلے پر سر رکھ دیا۔ چمپا اس کے پاس کھڑی تھی۔

”خوبصورت آدمی، اگر میں تمہارے دل کو جان سکتی۔“

”تم نہیں جانو گی۔ مجھے کوئی نہیں جانے گا۔“ عامر رضا نے جواب دیا۔

موٹر پھر ایک دھچکے سے اسٹارٹ ہوئی۔ کمال نے گانا شروع کر دیا تھا۔ چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہوئی۔ اس میں ان سب کے چہرے دھلے

ہوئے سفید نظر آ رہے تھے۔

”ہل_____ ہر طرف پل بنا رکھے ہیں۔“ گوتم غصے سے بڑبڑایا۔

”وہ سکندر باغ کی سڑک پر آگئے۔ قریب سے ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔“ ان سے ہاؤڈو یوڈو ہی کر لو کم از کم۔“

”یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولایتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔“ کمال نے کہا۔

شاہ زمن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے بیٹھے رہے۔ موٹر پھر آگے نکل گئی۔ سب چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پائپ کو ٹھونکتا بجاتا رہا، اگر مجھے کوئی یہ بتا لادے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں نے ان سے دلیلیں چھانٹیں پر مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں_____ گر وہ کی سنگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

کمال نے دفعتاً کار روک لی۔ سامنے لار مارٹینر کالج تھا۔

”یہاں انہوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا۔“

مال اور عامر رضا اور ہری شنکر نے انگلیاں اٹھا کر یک زبان ہو کر کہا۔ ”تم اتنا پڑھتے کیوں ہو؟“ انہوں نے پلٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

”یہ عجیب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔“ طلعت نے کہا۔ گوتم چپکا

رہا۔

وہ سب اتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔
 اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کو ان میں پھر پڑھائی ہوگی۔
 چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی Bas-relief کے گلابی، سبز اور نیلے رنگ نیم
 تاریکی میں جھلما رہے تھے۔ دیوار پر زونی کا بنایا ہوا جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم
 کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طلعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔
 باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے۔

”آؤ۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔۔۔ میرے قریب“ طلعت نے مڑ کر دیکھا۔
 جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی اس نے اشارہ کر کے ان
 کو پھر بلایا۔

”مجھ سے باتیں کرو“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے کوئی باتیں نہیں کرتا۔ دن بھر
 یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکچر ہوتے ہیں۔ میری
 طرف کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔“ وہ سو سو کر کے رونے لگی۔ طلعت بڑی
 گھبرائی کہ اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔ ”سنو میری بات“ طلعت نے
 سمجھانے کی سعی کی۔ ”تم ابدیت کے نقطے پر دھیان دیا کرو۔ وقت کے مختلف
 ٹکڑے دراصل۔۔۔۔۔“

”وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے؟“ کمال اونچی آواز میں گوتم
 سے کہہ رہا تھا۔

”یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا، وہ
 اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے سکی شیر نے کھالیا یا چڑیوں نے اسے کی داڑھی میں

گھونسلے بنالیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھارومنی کی موسیقی سنتا ہوگا۔“ ہری شکر نے کہا۔

”اوم۔ اوم۔ اوم“ یہ آوازا ب سارے میں گونج رہی تھی۔ فضا میں اس آواز سے لرز اٹھیں۔ ہری۔ ہری۔ ہری۔ وہ جھیل کو پیچھے چھوڑ کر سرخ بحری والے راستے پر چلنے لگے۔ چپا نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھوا، ایک پٹا ٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

”شنو، جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔ ہری۔ ہری۔“ چپا نے دہرایا۔
تہ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے، اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جا رہی ہے۔

لابریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔ کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔ لاطینی، فرانسیسی، انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ ان کے معنی اگیا بھتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔ بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی، کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔ توپ نے گرج کر اطلاع دی ”میرا نام لارڈ کارنوالس رکھا گیا تھا اور میں سرفنگا پٹم میں استعمال کی گئی تھی۔“ ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر ایستادہ مجسمے زور زور سے قہقہے لگانے لگے، پھر طلعت کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔ آؤ دلکشا چل کر پد منی اچار یہ کے یہاں کافی پیئیں۔ سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کر وہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد کمال، جو راستے میں سے کہیں غائب ہو گیا تھا، ان سے آن ملا، وہ

سب دلکشا کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

”تم کہاں چلے گئے تھے۔“ گوتم نے غصے سے پوچھا۔

”میں نے سنا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بسنت کا تہوار بہت دھوم سے منایا جاتا ہے، اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر مکلو ڈبیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پائپ بجا رہا تھا۔ پھر رجب علی فضل علی قوال نے بسنت کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا تھا، پھر لندن کے بادشاہ کا جام صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجینئرنگ کی دھت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں الم غلم جمع کر رکھی ہیں۔ ایک وہ حامس ڈیپنم ان کو فنی چڑھاتا رہتا ہے۔ لیکے ایک اسٹیمر گوتمی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک سخی میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ بشب ہیر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر کھڑے بادشاہ انگریز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، پھر وہ سب کو اپنی کچر گیلری میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی انگریزیت ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا۔ پھر رجب میں فرح بخش سے واپس آ رہا تھا تو راہ میں صاحب ریڈیڈنٹ ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا۔ پھر رجب میں فرح بخش سے واپس آ رہا تھا تو راہ میں صاحب ریڈیڈنٹ بہادر جوڑی دار پکڑی سرچچ گوشوارے پہنے، پندوستانی جامے میں ملبوس، جھالردار پاکلی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟ کہاں: بادشاہ کا جلوس ہے۔ کورونیشن۔ میں نے پوچھا: کون سے بادشاہ

کا؟ ایک کے دربار سے تو میں ابھی آ رہا ہوں بولے: وہ تو مر گئے ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں، عجب تماشا ہے۔ یار ہری شکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماش کا اجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوٹھی تھی جس میں اندھیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک مور سو رہا تھا۔ سامنے بڑے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انہوں نے کوٹھی کے برآمدے میں جا کر پدمنی آغا زدی، وہ اور اس کامیاں باہر آئے۔ ہلو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”کافی بناؤ۔“ کمال نے حکم چلایا۔

کوٹھی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو سنہ ستاون میں یہاں کھیت رہے، وہاں جھاڑیوں میں گھس کر انہوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کنبے پڑھے۔

لفٹنٹ پال، فورتحہ پنجاب رائفلرز۔ نواجوں کپشین مک ڈیلاڈ، ۹۳ ہائی لینڈرز۔

لفٹنٹ چارلی، ڈیش ووڈ۔

”ہلو۔۔۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔۔۔“ ان تینوں نے سامنے آ کر بٹاشت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

”ہلو چارلی۔ لو پائپ پیو۔“ گوتم نے ان کو تمباکو پیش کیا۔

پھر نواب قسیہ محل نے چنبیلی کی جھاڑیوں سے نکل کر کہا: ”اگر کوئی مجھے دل کا چین دلا دے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں۔“

”میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا۔“ چمپا نے نواب قسد سیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گویا وہ بھی کالج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پانچے سمیٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ ٹہلتے ہوئے دلکش محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرح چلے گئے۔

”ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سرے سرے شاہ زمن بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ دیکھو اتنا مزا آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں اڑی ہو؟“ ملکہ نے چمپا سے پوچھا۔

”نہیں مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا؟“ چمپا نے مصر رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات نال رہی تھی، وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

”تم تو بڑی سخی مشہور تھیں، تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنؤ کے تحت پر نہیں بیٹھی۔ لاکھوں روپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ۔ کہ اس سخاوت اور محبت کے بدلے میں دنیا نے تم کو کیا دیا۔۔۔ اللہ بتاؤ نا بھئی۔“

”جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔“ ملکہ بے دھیانی سے گنگنا رہی تھی۔ ”یہ میرے بادشاہ کا مصرع ہے۔“ اس نے چمپا کو مخاطب کیا۔ ”تم کو شعر پسند ہیں؟“

باغ بسنت کے سارے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

”برکھارت تھی اور تم دلکش محل میں تفریح کے لیے آئیں، اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے، تم نے لے کے سنکھیا پھانک لی۔۔۔ ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب

ہے۔ کیا مرد اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لیے انسان جان پر کھیل جائے۔ ان کی توانائی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ اتنی سی بھی۔۔۔۔۔“ چمپا نے انگلی پر انگلی رکھ کے بتلایا۔

قدسیہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اے لو۔۔۔ وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔ آج پورنماشہ ہے نا۔ بادشاہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہوں گے۔ مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔“

”کہاں جاتی ہو۔۔۔۔۔؟“ چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

”کہیں نہیں۔ ہم سب یہیں موجود ہیں۔ ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں؟ بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلاتے ہیں۔“

”چمپا۔۔۔۔۔ باجی چمپا باجی۔۔۔۔۔“ رات کے سنائے میں کمال کی آواز سنائی دی، وہ پھتر سے اٹھ کر دل کش محل کی طرف چل پڑی۔ کھنڈر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گٹا رہا ہے تھے، سب لوگ اس پاس بیٹھے تھے۔ ”لڑکیو، چلو کافی تیار ہے۔“ پدمنی نے پکار کر کہا۔ اندر کھنڈر کے ایوانوں میں نصیر الدین حیدر کے حرم کی انگلیز بیگمات بڑے بڑے جھالدار سائے پہنے، کہنیوں کے بل بیٹھی بڑی محویت سے گٹا رسن رہی تھیں۔ پھر ان بیگمات نے مل کر پوکا شروع کر دیا، وہ سب سیڑھیاں اتر کر پدمنی کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

چمپا پھر تنہا رہ گئی۔

”ماد موزیل۔۔۔۔۔ وزیریت تری شمار ماں۔۔۔۔۔ ماد موزیل۔“ اس نے

مڑ کر دیکھا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کافر پنج حجام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولرس انداز میں اس نے اپنا جھالروار رومال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دو زانو جھک کر اس سے کہا: ”تشریف رکھیے۔“

چمپا نکلی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

”مادموزیل۔۔۔ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجئے۔ جی بھر کر خوش رہیے۔ غم بیکار ہیں۔ آئیے میں آپ کو مردہ عورتوں کا گیت سناتا ہوں۔“ اس نے ایک جھجھکار کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل اچاریہ وہیں بھول گئے تھے۔

”مجھے بتاؤ کہ ایڈی فلورا اور خوبصورت ہائی پلشیا“

اور تائیس کہاں چھپ گئیں؟

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلایا تھا؟

مادر خداوند _____ ان سب کا کیا ہوا؟

”لیکن _____ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے!!“

”ماد موزیل‘ یاد رکھیے‘ خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں۔ حسن پرنازاں ہو جئے دولت اور شہرت اور عزت پرنازاں ہو جئے۔ وقت بہت کم ہے‘ بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائیگا۔ میری سنئے۔ میں پیرس کا حجام۔ میں نے بادشاہ کی ایسی حجامت بنائی کہ پورے چوبیس لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ سارے لکھنؤ پر میری حکومت تھی۔ بادشاہ میرے تابع تھے۔ ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں۔“ اس نے اپنے ساٹن کے جوتوں کو ادا سی سے

دیکھا اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤں کی خوشبو آرہی تھی۔

چمپا سیڑھیاں اترنے لگی۔ ”یہ گٹار لیتی جائے۔۔۔ کرنل اسے یہیں چھوڑ گئے۔ اب میں جا کر کہیں اور منڈلاؤں گا۔ بوں نوئی ماد موزیل۔“ اس نے جھک کر بڑے اسٹائل سے کہا۔

پدمنی کے لان پر بیٹھ کر کافی پینے کے بعد وہ موٹر کی طرف بڑھے۔ دور کھنڈر پر چمپا ڈریں اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مرگھٹ تھا۔ میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دور پر دل کشا کلب میں ناچ ہو رہا تھا۔ ”آؤ چھتر منزل چل کرنا چیں۔“ کمال نے تجویز کیا۔

”آج تم لوگ کیارت جگا منانے نکلے ہو۔“ پدمنی نے ہنس کر کہا۔

”ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر برباد کیا جائے؟“ ہری شکر نے جواب دیا۔ ”تم بھی چلو۔“

وہ پھاٹک سے نکل کر کاسلز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے، پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔ سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

”ارے آج تو یہاں بسنت کا میلہ ہے۔“ طلعت نے خوش ہو کر کہا۔

”آج معلوم ہوتا ہے سلطان عالم اوپیرا بھی کر رہے ہیں۔“ نرملا نے کہا۔

”چلیں اندر۔۔۔؟“

”کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔“ کمال نے تذبذب کے ساتھ

کہا۔

”چلے چلو۔ چوبداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے۔“ شکر نے

جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کا فرش جھل جھل کر رہا۔ اسٹیج پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلملا رہے تھے۔ پکھراج پری گارہی تھی:

رت	آئی	بست	بہار
کھلے	جرو	پھوئرون	کے
ہر	کے	دوار	مالی
گر	اڈارت	گیندن	کے

وہ سب بچوں کے بل چلتے اسٹیج کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طلعت نے چپکے چپکے ساتھ ساتھ گنگنا شروع کر دیا۔

پھر دھن بدلی۔ اب پکھراج پری نے اپنی غزل شروع کی:

ہے جلوۂ تن سے درو دیوار بستی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بستی
کیا فصل بہاری نے شکوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سر باز بستی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آ گئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان

سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پری گائے جا رہی تھی:

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں

جھالے بھادوں کے وہ ہیں اور یہ گھٹا ساون کی

اوپیرا ہوتا رہا۔ یہ لوگ مجمع میں رل مل کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان سب کو

روشن دان میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے، جو سنگھار کمرے میں کھڑی اسٹیج پر

جانے کی تیاری کر رہی تھی، گھبرا کر کالے دیو سے کہا: ”ادھر نظر

ڈالو _____ آنے والے وقتوں کے بھوت ہمیں گھور رہے ہیں۔“

کمال نے ایک چوبدار سے پوچھا: ”مہنر پری کون ہے۔“

”ارے اس کو نہیں جانتے خداوند _____ چمپا بائی۔ شاہ زمن غازی

الہ دین حیدر کے زمانے سے ان کی کمان چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کے بیٹے میں

آگئیں مگر وہی آن بان وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی چھب ہے کہ صلی علی۔ ان

سے بہتر سبزی پری کا سوا انگ اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ اللہ نے گلے میں نور اتار دیا

ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنؤ کے باشندے نہیں؟“ کمال جلدی سے وہاں

مے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی:

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان

تو اپنے معشوق کو سبز یری پہچان

تو اپنے معشوق کو۔۔

اب شہزادہ گلخان اسٹیج پر آچکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا:

محلوں میں رہتا ہوں میں عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا نام مرا گلفام

پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا:

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیروں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ
وہ لوگ بارہ دری سے باہر آ گئے۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آرہی تھی:

اڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ

باہر جل پریوں کا پھانک، چینی باغ، جلو خانہ۔۔۔ سب جگہیں روشنی سے بقتعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کار ہس ہو رہا تھا۔ جان عالم گیر واکپڑے پہنے، دھونی رمائے، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے شہر کے باشندے سب گیارو جوڑ پہنے تھے۔ درگا پر شاد کتھک مولسری کے سائے میں پھول کی تھالی کے کنارے پر ناچ ناچ کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی ابل رہا تھا۔ باغ کی نشستیں سنہرے اور نقرئی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے جوگن کی بھیر ویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں:

تارکشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانگ کے
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی

آئی، بہار ساقیا! جام شراب دے دے پلا
پھول کھلے، پھلے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی
بہکے زمین شعر میں پاؤں امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا، نکلا زبان سے یا علی
جو گن کی آواز رفتہ رفتہ چاندی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والے کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آ گئے۔ موٹر میں بیٹھ کر
نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن الدولہ کی سرخ
رنگ کی عمارات تھیں سڑک کے اس پار چھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں
استادہ تھے۔ اندروائیس کی آوازیں آرہی تھیں۔ موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔
پھاٹک کے اندر جا کر انہوں نے کاررو کی۔ لکھنوکا اعلیٰ فیشن اسپل طبقہ سیڑ ڈے
نائٹ منار ہاتھا۔

”آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے۔ ابھی ایک اے۔ ڈی۔ سی کو میں نے اندر
جاتے دیکھا، ہری شنکر نے اظہار خیال کیا۔

”کون والا اے۔ ڈی۔ سی، وہی سسی جوا طالوی جنگلو معلوم ہوتا ہے۔“ طلعت
نے بے دھیانی سے پوچھا۔

”بکومت۔۔۔ تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار۔۔۔ کسی ہے
تو ہوا کرے، تم سے مطلب؟“ کمال نے ڈانٹا۔

وہ اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس
ایڈن نے لکھا تھا: ”الف لیلے کی زبیدہ نے اپنے نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر

خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی، وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہوگا۔“ کمال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے نارنجی نقش و نگار دیکھتا رہا۔

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو اون لکر میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں مسوری، مینی تال، شملے اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

”ان کا بھی ایک زمانہ ہے۔“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیڑھیوں کے نیچے گوتمی آہستہ خرامی سے رواں تھی، وہ سب اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹیرس سنسان تھا۔ سیڑھیوں پر نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ ننگے پاؤ بیٹھے تھے، انہوں نے اپنا ایک جوتا لہروں میں پھینک دیا تھا، جب وہ ذرا بہتا ہوا دور نکل جاتا تو یہ تالی بجاتے تاکہ چوہدار آئے۔ جب کوئی چوہدار نہ آتا اور محض ہال روم کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے، تھوڑی دیر بعد دوسرا جوتا پانی میں پھینک دیتے، اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہلاتا رہے تھے۔ دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوتم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

”نہیں۔ ہم مشکبو گڑ گڑی پیتے ہیں۔ کوئی ہے۔“

”معاف کیجئے گا۔ ہم لوگ ہیں۔“ گوتم گھبرا کر کہا۔

”تم لوگ کون۔“ انہوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

”بس ہم ہی لوگ۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

”ان کو یہیں چھوڑ دو۔ کیا کریں گے ہم ان کا۔ آؤ چلو۔ یہاں سے۔“

”کمال نے چپکے سے گوتم سے کہا۔“

نصیر الدین حیدر بادشاہ کو پانی کے کنارے تنہا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کہا نہیں اور پاکی برادر اور مہریاں اور یکے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش، بساطی، کمہار، شہر کی اصل آبادی، اصل اہل زبان، وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پر اسرار شہر تھا۔ حویلیاں، پھاٹک، حاطے، چھتے، پیچ در پیچ تنگ و تاریک گلیاں جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی، آصف الدولہ کا چوک، نحاس، اکبری دروازہ، سبزی منڈی، حسین آباد، گول دروازہ، کٹوریہ پارک، بڑا امام باڑہ، مچھی بھون، رومی دروازہ۔

آصف الدولہ کا لکھنؤ لکھنؤ کا دل، سڑکیں اور گلیاں اب سنسان پڑی تھیں۔ یکانخت بارش کی پھوار شروع ہو گئی۔ بہار کی بارش جو چند منٹ برس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے ایرادات ہاتھی کی طرح ایک بادل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالا خانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

”میرا ہمیشہ جی چاہا کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں“ طلعت نے کہا۔

”ارے یہ تو تنویر کا مکان ہے جو ریڈیو اسٹیشن آتی ہے۔“ نرملا نے کہا، نیچے اس کی اسٹوڈیو بیکر کھڑی تھی۔ ”اس کے پاس چلیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔“ طلعت نے مصر رہی۔

”حکومت۔“ چمپا نے ڈانٹا۔

”ارے بچیا، آپ کو تو اس طبقے کو سوشیالوجیکل نقطہ نظر سے۔“

”بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔“ گوتم اور کمال موٹر سے باہر اترے
کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہوائ ناک میں داخل کر رہے تھے۔

دکانوں کے برآمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو جلدانی کا انگرکھا پہنے لکڑی
ٹیکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالا خانے کے نیچے موٹر روکے کھڑا دیکھ کر اس
نے آہستہ سے لاجول ولاقوۃ کہا اور آگے بڑھ گیا، پھر وہلو ہے کے پل پر سے
گزر رہے ڈالی گنج ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا، دوسری طرف
بادشاہ باغ۔

”آؤ پروفیسر بنرجی کے پاس چلیں۔“ انہوں نے نعرہ لگایا۔
وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھاٹک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوٹل کے پہلو
میں کھلتا تھا۔ باغات یہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سرخ بارہ دری چاندنی
میں نہائی کھڑی تھی۔ یگور لائبریری کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پر سکوت پر
جلال نظر آرہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔۔۔۔۔ عمارت نے
کہا۔۔۔۔۔ میرے اندر آؤ، میں تمہارے دکھ بھلا دوں گی۔

”الفاظ دکھ بھلاتے نہیں، دکھ اور گہرا کرتے ہیں۔“ گوتم نے جواب دیا۔
”خاموشی سب سے افضل ہے۔ اسی لیے لوگ منی ہو جاتے ہیں۔ خاموش
رہے ہیں، ہری شنکر نے کہا۔“

”وہ نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارات پر چاندنی برسا کی۔
نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ۔
بے چارے نصیر الدین حیدر۔“

پھر انہوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلنا شروع کیا، دو درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر برجی خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

”یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں؟“ کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

”شب بخیر۔۔۔ پروفیسر۔۔۔“ انہوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا اور واپس آگئے۔ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کو اڈرینگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن شملتی ہوئی موتی محل برج پر جا نکلتی تھی۔ اس کے سرے پر رجسٹرارز آفس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں وائس چانسلر رہتا تھا۔ برج پر آن کر انہوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچے راستے پر اتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی طرف جاتا تھا۔

آدھی رات کا کجرجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر ندی کے بہتے پانی کو دیکھا، وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، چمپا، طلعت، نرملا اور تہینہ دوسری سیڑھی پر موجود تھیں۔ کمال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر امام باڑہ نجف اشرف اور موتی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا حرز اُٹل ہو چکا تھا۔

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ

بھیروں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

گوتم نے آہستہ سے دہرایا۔

”افوہ _____ گوتم بھائی _____ تم تو اندر سبھا کے شعروں پر اتر آئے۔
 کس قدر ڈیکڈنٹ ہوا!“ طاعت کہہ رہی تھی۔
 وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”چلو یا راب محفل برخاست کی جائے۔ ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزروی
 _____“ کمال کی آواز آئی۔
 وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے۔
 میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا۔ گوتم نے اپنے جائے قیام کی طرف جاتے
 ہوئے اداسی سے سوچا۔

پروفیسر بنرجی بین الاقوامی شہر کے مالک ماہر اقتصادیات تھے، ان کی کوٹھی پر
 بھی بڑی اداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون۔ ان کا گھر سچ مچ علم کا مسکن تھا۔
 پرامن، خوبصورت اور خاموش۔ سبہ پہر کو اکثر لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں لیے ان
 کے گھر پہنچتے۔ پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے نظر
 آجاتے یا اندر چاء کی میز پر بیٹھے ہوتے اور کھانے کے کمرے کے خنک اندھیر
 ے میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلملایا کرتے، اس وقت وہ اپنے
 شاگردوں سے بڑا اداس آواز میں باتیں کرتے۔ پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں
 میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا، اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی۔

جاڑوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں مذہب، فلسفہ، سیاست، عمرانیات، آرٹ، ادب۔ ذہن کی دنیا وسیع تھی بڑے پرکشش، بڑی تکلیف وہ اور انتہائی پرخطر۔

”پروفیسر —“ ایک روز چمپا نے پوچھا، ”ذہن اور جذبات کی کش مکش سے کس طرح نجات ملے گی؟ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو درختوں کے سائے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش مکش ہر سطح پر جاری ہے قومیں، حکومتیں، انسان، فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسری سے الجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی علمداری ہے اور بے اطمینانی، نفرت، کھنچاؤ، دہشت، وفاداریوں کی کش مکش، اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بھتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پلک جھپکتے ہیں غائب۔ مجھے بڑا شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

”جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیا! بھارگوا کے، پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ ان سوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرٹی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں لہذا میری تہذیب دوسری ہے، میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی باسی ہوں، اپنے لیے دوسرا

ملک کہاں سے لاؤں؟ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے، وہ جرمن ہوں تب بھی یہودی ہیں، امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قویمیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے، چندے جمع ہوتے ہیں، ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ دو طرح کے پناہ گزین تھے: ایک وہ جنہوں نے اپنی مرضی سے ترک وطن کیا، دوسرے وہ جن کو مجبوراً نکلنا پڑا تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی، میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوشی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترک وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا چاہ رہے ہیں، مجھے اکثر یہ تصور بہت بھلایا کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا، نہ خواب دیکھے جاتے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کش مکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

”امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے، میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈروولہن، لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں مہاتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیے اور قائد اعظم جناح کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ ایک دفعہ پچھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے، مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی

ایک نہ تھے یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا کچھ سا تھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے۔“

”تم نے کبھی غور کیا۔“ پروفیسر نے اوپر درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی ایک گوریا کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا، ”تم ہسٹری کی طالب علم ہو۔۔۔ کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تھے۔ جنگیں ہوتی تھیں مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں، پھر انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں، ہزاروں قومیں بستی ہیں، ہندو مسلمان ایک دوسرے سے منفر ہیں، یہ ملک ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ راجستھان ہی دیکھ لو یا انیسویں صدی کے سفر نامے، لیکن تم کو ۱۷۵۷ء یاد ہے جب اسی لکھنؤ میں ہندو امراء اور رعایا نے برہمنوں کی حکومت کو جو بہر حال مسلمان حکومت تھی، بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑائیں، مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون۔“

”مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں۔“

ویشنو بھگتی کا مذہب ہے، اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔

پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے، یہ کوئی بات بات نہ ہوئی۔

ہاں، لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔

”اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہو سکتا۔“

تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو، ایسا نہ کرو۔“

”پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت، میں کیا کر سکتی ہوں، کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شام تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے، وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں بٹی تھی: کفر اور اسلام انہوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرا انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑا مصیبت ہے پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملا کے یہاں رات گئے تھے بیٹھے رہے تھے، وہاں ہم ماضی کے متعلق سوچ رہے تھے اور وقت کے گورکھ دھندے کے متعلق گھر واپس جا کر میں دیر تک جگا کی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا واپس جا کر میں دیر تک جگا کی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے، ہم مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پر آشوبت ہم کو کرنا پڑتی ہے، میری قوم نے جو جرم کیے ہیں یا کر رہی ہے بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہوگا کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج اس لمحے تک ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کنارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یا دنیا تباہ ہوگی یا پر مسرت۔ تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی

مجھے وحشت ہوتی ہے، مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اسٹیریو ٹائپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے، میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کل میں نے نرملا کے گھر سے لوٹ کر کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آگئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک نظم بھی درج ہے۔ فیض آباد کا ماجرا ہے جو اچھا دھیا کہلاتا ہے۔ لکھا ہے۔ مغل بادشاہوں اور ان کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں، جب مندر گرے تب بھی ایک ہندو جوگی اہلی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑھے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھا کر دوار بنانے کی کوشش کی۔ بڑا فساد رہا، فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرابا ہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان عالم کو عرضی بھیجی جو نظم کی صورت میں تھی، میں نے وہ نظم نقل کر لی تھی۔ آپ کو سناتی ہوں۔“

اس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے پروفیسر کو سنانا شروع کیا:

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہ اودھ کی خدمت میں
 قریب دیر مہابیر واجب التعزیر
 بنا تھی مسجد اسلام ہم چو بد منیر
 لگے بنانے بڑھا کر یہ کافر مقہور

سوار مسجد اقدس میں خانہ لنگور امید ہے کہ شہنشاہ قبلہ عالم
 ابوالمنظر و منصور و خبر و اعظم
 شہپر رفعت و قدسی صفات والا جاہ
 خدیو کشور ہندوستان، فلک درگاہ
 زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد
 کہ کافران اودھ پرشتاب ہوئے جہاد
 روانہ ہوگا شنبے کو لشکر اسلام
 برائے غارت و تاراج شہر کچھن و رام

”یہ مذہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیت میں گویہ ایک علیحدہ بات ہے کہ
 سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرضداشت پر کان دھرتے
 انہوں نے انہی مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین
 لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور ایودھیا
 میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاع سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا
 ہے۔ یہ بھی ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔
 پروفیسر، بتاؤ، میں کس کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے، جنہوں نے میرے
 بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلمہ گو بادشاہ سے نفرت کروں، جو ہندو دیو مالا کا
 عاشق تھا، کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کا قتل کرواتا تھا؟
 ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو کچھن اور رام کے پر امن خوبصورت شہر کو تاراج
 کرنے جا رہے تھے؟ یا ان ہندو جو گیوں کو مورد الزم ٹھہراؤں جو رام گھاٹ پر

دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں؟“

”اب کمال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے نظم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔“

”اور پھر تم متوقع ہو۔“ کمال نے کہنا شروع کیا، ”تم جو فخر یہ اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہو اور سو منات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی دھاندلی ہے۔“

”کمال! تم تو بالکل مہاسبجائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ تم نفروں سے آزاد بڑی وسیع نظری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمہاری اس شدت کی قوم پرستی بذات خود ایک اور تعصب ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”اس منطق کا میں جواب نہیں دے سکتا۔“ کمال نے کہا، وہ دونوں اٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔

”اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کے مسلمان قوم کی سائیکولوجی عجیب و غریب ہے، تم کو کبھی اس سرزمین سے محبت نہیں ہوئی۔ چھوٹے ہی میرے مولا بد لے مدینے مجھے، کانعرہ تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار برس یہاں، تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑ رکھا عجم اور عرب سے، پھر مجھے مہاسبجائی بنا رہی ہو۔ واہ بھئی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جا ملے۔“ اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ ”کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایچی ٹیشن کیا کہ ان کے مہذب

میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہذا ان کے اوپر یہ قانون عائد نہیں ہوتا، انہیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کرو گی کہ جب لیگ نے یوم نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جو الزامات۔“

”کیا کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے _____؟“ چمپا نے بات کاٹی۔

”یہی عرض کر رہا ہوں _____ راجندر بابو نے کہا کہ لیگ نے جو الزامات کانگریس حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکوائری اور فیصلے کے لیے رکھے جائیں۔ لیگ نے یہ بھی منظور کر دیا اور کہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پر برطانوی حکومت تیار نہ ہوئی۔“

”ہاں، کیونکہ برطانوی گورنروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ برطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریس کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ہوش کے ناخن لو چمپا باجی۔ ۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفظ کے مخصوص اختیارات دے دیے گئے تھے۔“

”چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے۔“

”یقیناً _____“ کمال نے گلا صاف کیا، ”لیکن یہاں روس کی طرح ماٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کرو تان جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی۔“ چمپا نے کہا۔

”اور آپ کی تان جا کر کے مدینے پر ٹوٹتی ہے۔۔۔۔۔ ایٹم کے عہد میں
قرون وسطیٰ کے مذہبی تصورات لیے پھر رہی ہیں۔“

”دیکھو۔ تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔“

”کیوں نہ دہراؤں؟ دیکھیے چمپا باجی ساری بات یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور
پر پسماندہ ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصور ہے
۔۔۔۔۔ انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔

ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے رد کر دے۔ ایک
مخصوص قسم کی تنگ نظری ہے ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی، پھر اس کی انجلیجیا نے
سائنٹیفک ہونا سب سے پہلے سیکھا، وہ مذہب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس
کا ذہن انتہائی ریشہ دوانی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب، جمع تفریق۔ ظاہر
ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا
رسول کا عاشق۔ بات بات پر ہجرت پر تیار ترکی میں کسی کو چھینک آئی، آپ
بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کاٹا چچا، یہ بیکل ہو
گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجیری پیا بھی ہیں
محبوب الہی بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں
نے بنایا تھا مگر اس اسلامی بین الاقوامیت کے چکر نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔“

کمال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اٹھا کر پانی کا گلاس پیا۔ ”مسلمانوں کی
ساری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔۔۔۔۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا
”ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑ کے۔ شان و شوکت امپیر

یہ قوم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ بنو امیہ، بنو عباس، ایران کی حکومتیں، عثمانی ترک، ہندوستانی مغل، افغان، عرب، مصری _____ سب نے آپس میں کیا کیا خونریز جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا؟ مارا اسلام اسلام کی رٹ لگا رہی ہے۔“

”لیکن خلفائے راشد کا زمانہ _____“

”چمپا باجی _____ کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو! رسول خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی تو تمہاری ملت بیضی نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ جنگ جمل بھول گئیں _____ آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصب اور نفرت۔ تعصب کے مسئلے کو تو تمہارا اسلام بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنؤ کا شیعہ ہوں، مجھ سے پوچھو، شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر متنفر ہیں۔ نہیں چمپا باجی _____ مجھے مذہب نہیں چاہیے۔ فقہ اور حدیث اور امام غزالی اور ابن خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ انسان کو امن چاہیے اور روٹی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکار غزلی پر غور کر سکتا ہے۔“ اب وہ پھر پارٹی لائن چلا رہا تھا۔

کمال موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا تھا: ذہن پرست، باصول، ایماندار، شدید طور پر پر خلوص، تصور پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا، جنہوں نے اس سے صرف فرانسیسی پرو نسل شاعری اور وی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں کسی دوسرے دنیا میں بستے تھے۔ کمال اور گوتم اور ہری شنکر _____ یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں جانا چاہتی تھی، جہاں دیوار کے درختوں میں چھپے

ہوئے کانچ میں اور جن میں شوپال کی موسیقی بجتی ہے۔

”ہماری لڑکیوں اور عورتوں کو سستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں
کوڑے لگائے گئے۔“

اس کے کانوں میں کمال کی آواز آئی وہ جوش کے ساتھ بولے جا رہا تھا:
”ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تنہائی کاٹی۔ تم جو جیل جانے والوں
کا مذاق اڑاتی ہو، سوچو زندگی اور آزادی کسے عزیز نہیں؟ عمر عزیز کے ان گنت
سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے؟ محض ایک اصول، ایک نظریے کی خاطر
ہزاروں لوگوں نے جا کر قید خانے میں چکیاں پیسیں اور برطانوی سپاہیوں کے
ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے بھوکے تھے؟ کیا خالی جذباتیت کی
بناء پر انہوں نے یہ قربانیاں دیں؟ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے
مقامی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہنستی خوشی جا کر
کال کوٹھڑیوں بند ہو گئے۔ سیاسی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ
اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ
کی طرح آرام کرسیوں پر بیٹھ کر ان پر ہنستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعویٰ
کرتے ہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا
لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ راستوں پر چلے جائیں گے، تم کو
معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھڑی میں سانپ اور بچھوتھے۔ کن
کن مصائب کا ان سب نے سامنا کیا، مگر اب بجائے اس کے کہ متحد ہو کر ہم
ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کھپتلی بنے ہوئے ہیں۔ کمال کا

چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

”تم بڑے پکے نیشنلسٹ ہو کمال؟“ چمپا نے خائف ہو کر پوچھا۔

”ہاں ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہوگا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان انغلکچول قوم پرست ہیں؟ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں؟ کانگریس نے ان کی رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈور چمپا باجی اور ایک اور بات۔“ اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا، ”تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے، تم دیہات سے واف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کا اچھا رہے ہیں۔ تم کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو؟ اگر مادھو پور کی ہندو لڑکی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پئے گا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سسرال ہے، یہ انسانیت کی اقدار چمپا باجی جو مذہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔“

اب شام کا اندھیرا اچھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طلعت بیٹھی گوتم اور چند لڑکوں سے باتیں کر رہی تھی وہ اٹھ کر ان کی طرف آگئی۔ کمال کہتا رہا ”ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مراعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا۔ مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں مانا چاہیں، سکھوں کو اتنی، ہندوؤں کو اتنی۔ مڈل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں مڈل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کاریگروں کا تناسب کیا ہے اور ہنریائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کاریگروں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ان میں اور احمد آباد یا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے؟ وہ برا اور ڈالسیا۔“

”افواہ _____“ چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے ”وہی کمیونسٹ پارٹی کے گھسے پٹے دائل۔“

”تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا باجی۔“ کمال نے رنجیدہ ہو کر کہا۔
”طلعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔“ تم نے آج کا اخبار پڑھا؟“
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ کمال نے نیچی آواز میں جواب دیا۔
”کیا ہوا۔“ چمپا نے پوچھا۔

”میرے بابا خان بہادر نواب تفتی رضا بہادر آف کلیان پور لیگ میں شامل ہو گئے۔“ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ ٹائپ پر لوٹ گئے۔“
”ماما سے مایا ملے کر کر لے ہاتھ _____“ طلعت نے کہا۔
”تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات _____“ کمال نے کہنا شروع کیا۔

”بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقداروں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ کانگریس حکومت بنتے ہی پھر وہی کھڑا شروع ہو جائے گا: زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ۔ انہیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ فیوڈل اقدار کے آخری رکھوالے ہیں، مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے والد کا نقطہ نظر خوب سمجھتا ہوں، میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ اس سرزمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترک وطن کر کے سندھ اور بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔ بابا بوڑھے آدمی ہیں، میں ان کو اس وقت دل شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہو گا۔“

”کمال وطنیت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصور اصل چیز ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون؟ کیا تم آزادی افکار کے قائل نہیں؟“ چمپا نے جواب دیا۔

”وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پھینکا جاسکتا۔“ طلعت نے غصے سے کہا۔

”کیا وطن ہے یار! بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔“ چمپا نے کہا۔
طلعت اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ”بجیا آئیے۔“ اس نے کہا، ”پروفیسر چاء کے لیے بلا رہے ہیں۔“

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گومت بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر چمپا کو نمستے کیا۔
”چمپا باجی مسلم لگی ہو گئی ہیں بڑ بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے لہذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی۔“ کمال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے ققموں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کا غم گہرا ہوتا گیا۔

چمپا چلو، نوبے سے ریہرسل شروع ہے، پھولوں کے پرے سے کسی لڑکی نے پکارا۔

”اچھا۔“ وہ سائیکل سنبھال کر پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روش پر سے گزرتا دیکھتے رہے۔

کیلاش ہوٹل میں سالانہ ڈراما تھا۔ لڑکیاں ہفتوں سے تیاری میں جمی تھیں شام کو ہال میں یا گھاس پر ریہرعلیں کی جاتیں۔ موسیقی کمپوز ہوتی۔ ناچ کی مشق کی جاتی۔ کوئٹومزے کے ڈیزائن تیار ہوتے۔ اسٹیج کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔ فیروز جہیں نہایت تندہی سے سب کو پارٹ یاد کروا رہی تھی۔ کملا انارکلی تھی۔ طلعت دلارام، ایڈ سلیم، ایک اور سوانگ، پھر کوڈرینگل میں اسٹیج تیار ہوا۔ وائس چانسلر اور اسٹاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرانے اسٹیج کے پیچھے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔ اب کسم محل سرا میں کنزروں کے ساتھ بیٹھی کارہی تھی۔

لب جو ہو فرش آب ہو، شب ماہ ہو، بادۂ ناب ہو
ای نڈ درتچے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ راوی کے نوجوان ملال
_____ انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیر سے
محبت _____ کیسی ہنسی کی بات یہ _____ سب خواب کی طرح گزرتا گیا،
پھر پردہ گرا اور لوگ باتیں کرتے باہر نکلے۔

عامر رضا نے چمپا سے کہا: ”ڈائریکٹر صاحب آپ نے کمال کر دیا۔“
کمال نے کہا: ”چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہیے _____ انارکلی سے بہتر
کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو؟ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہیے۔“ پھر وہ مجمعے
میں غائب ہو گیا۔

گوتم نے قریب آ کر کہا: ”شمپا باجی کیا آپ کمال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں کمال نے آپ سے کافی سخت باتیں کہیں، میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداسی ہے، اس اداسی میں اضافہ نہ کیجئے۔“

”نہیں۔“ اس نے گوتم کو جواب دیا، میں دراصل آج کل جینے کے مختلف روپے اسٹڈی کر رہی ہوں۔

”میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔“ طلعت نے بٹاشت سے قریب آ کر کہا، وہ ابھی تک دلا رام کا لباس پہنے تھی۔

”آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکسپریشن اپنے چہرے پر قائم رکھوں: وقار، بٹاشت، سنجیدگی۔۔۔۔۔۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساس کمتری ہے۔۔۔۔۔۔ اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غرور پر محمول کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چلبلی لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔ رکھ رکھاؤ سے رہو تو بوریاد دماغ سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ بے چاری چار آدمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے، کو نے گھوس ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمننا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں کیجئے تو لگتا ہے افلاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے۔ یا خلیل جبران کا المصطفیٰ دیواروں کے باغ میں مصروف گفتگو ہے۔ نہیں چمپا باجی۔ جینے کے روپے کے

متعلق نہ سوچئے۔“ پھر وہ بھی چھلاوے کی طرح مجھے میں غائب ہو گئی۔

گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔ ”کس قدر رڑاتی ہے یہ لڑکی۔“

”مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں۔“ چمپا نے

کہا۔

”الجھنوں سے ہم سب خود کو بچا سکتے ہیں۔“

”واقعی؟“

”ہاں چمپا باجی۔“

”تم کبھی الجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔“

”شاید۔۔۔ نہیں۔“

سڑک پر مورلی کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ہواؤں کے راگ بہر سریلے تھے وہ

دفعۃً پھاٹک کی پلپٹا کے پاس ٹھٹھک گئی۔ ”نہیں گوتم، میں کمال سے خفا نہیں

ہوں، مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔“

”آپ درجہ شہادت حاصل کرنے والی ہیں! یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟“

”تم۔۔۔ تم لوگ بڑے کمینے ہو،“ اس نے تلخی سے کہا۔

”ہم لوگ محض بے حد پر خلوص ہیں، مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے

اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے۔۔۔“

”تم۔۔۔ تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔۔۔ مجھے ایسا لگتا

ہے جیسے میں ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک

کے بعد ایک فرائلے سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔۔۔ وہ پردے جن

پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر۔ اب آخر صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے۔“

”چمپا باجی، آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے۔ آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبت ہے، بس ساری بات یہ ہے، باقی سب فروعات ہے۔ اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔“ گوتم نے حسب معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

نفرت سے چمپا نے اسے دیکھا: ”الفاظ“
”ہاں۔ صریحاً۔ میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔“
”اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟“

”کوئی چیز بے معنی نہیں۔ خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔“
”طاعت ٹھیک کہتی تھی، تم بھی پوز کرتے ہو۔ تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے۔“

”چمپا باجی۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”اللہ خفانہ ہو جینے۔ چلے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلائیے، وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ اور اللہ افسردہ نہ ہو جینے۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے۔“
”آئیے۔۔۔۔۔“

چمپا چاند باغ کی ایک پہاڑی لیکچر رسیٹا ڈکشت کے ساتھ کالج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کالج میں رہتی تھی، وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ سامنے امرودوں کے اندھیرے باغ میں رکھوالا سگوں کو اڑانے کے لیے آوازیں لگا رہا تھا

جورات کا بسیرا لینے کے لیے ٹہنیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کوٹھی میں پیانو بج رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیرا کیا۔

گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”چمپا باجی۔ آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم۔“
”واقعی؟“

”چمپا باجی۔ ایک بات بتائیے۔“
”پوچھو۔“

”آپ بھیا صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں۔“
”کئی سال سے۔“

”اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا؟“
”پڑھا اور کیا کیا!“

”اس کے بعد؟“
”اور پڑھا۔“

”اس کے بعد؟“

”بس پڑھتی چلی گئی۔“ چمپا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”اور بھیا صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا خیال آپ کے لیے ایک بڑی

ریسا نہ عادت میں شامل ہو چکا ہے گو آپ خود رکیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتلاؤں۔ آپ ذرا غور کرتیں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق _____

”واہیات باتیں مت کرو۔“

”واہیات۔ غضب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلواسٹونگ نکلیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے؟ بڑی عمدہ چیز ہے، میں خود اس میں اکثر مبتلا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت برا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی، سوری۔ اتنا سہانا سہ ہے، مجھے چاہیے تھا کہ آپ سے بجوا کر سنتا ستار پر گت باگی شری، تین تال اور یہاں میں نے آپ کے پرابلمز کا تجزیہ شروع کر دیا۔“

”یہ دوسروں کے پرابلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کالج میں پڑھاتی ہوں۔“

”میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پٹے پٹائے جملے دہراتے گزر جاتی ہے۔“ وہ منہ لٹکا کر درتپے سے باہر دیکھنے لگا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومینک ہونے کے لیے آپ کے بیا صاحب کون سے میز ازم استعمال کرتے ہوں گے، کون سے جملے دہراتے ہوں گے۔ سنا ہے، فرنیچ بہت فرسٹ کلاس بولتے ہیں۔“

”لیکن آخر تم بھیا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟“ چمپا نے کہا وہ دفعتاً جھینپ گیا۔ اس قدر جھینپا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”مجھے چڑنے دیجئے، آپ سے مطلب؟“ وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔

اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور نکلا، چمپا نے حیرت سے سوچا۔

”مطلب یہ۔“ چمپا نے کہا، ”کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔ تمیز بھی کوئی چیز ہے، یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو۔ یہ کیا ہر سے بلڑوگا، فوجداری۔ یہ چندو خانہ ہی کیا کم تھا کہ اوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔“

”بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرما رہی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھا دیں، ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔“

”میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں؟ اور دوسری بات یہ کہ۔“

”دوسری بات یہ ہے چمپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپنی کی اور بات تھی، وہ تو پیدا ہی اسی لیے ہوئی تھیں، مگر آپ _____ حد ہے۔“

اب چمپا جھپٹتی۔ ”میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔“ اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

”میں رائے کب دے رہا ہوں؟ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی، مگر آپ ہیں کہ _____ آہ _____ اس بظاہر سمجھ دار تعلیم یافتہ لڑکی کو دیکھو۔“ اس نے ٹہل ٹہل کر تھیر ٹیکل انداز میں کہنا شروع کیا: ”یہ معاشیات کی استاد ڈاکٹر کلس کی طالب علم، برس سے کس مصیبت میں گرفتار ہے _____ اے رومانیت کی شکار نادان کنیا۔“

کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دباڑا۔

”گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔“ چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

”اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسیٰ کی طرح پچکارا بھی کریں گی۔ میں کہتا ہوں یہ تک کیا ہے؟ یعنی غضب خدا کا جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اولڈ والٹس ناچے، پلٹنکوں اور پارٹیوں میں کالج کی لونڈیوں کی موسیٰ کھینچتا پھرے، خود لونڈیوں کی طرح حسین ہو اور قیامت یہ کہ اپنے حسن پر نازاں بھی ہو۔۔۔۔۔۔ اس کی آپ پسند فرماتی ہیں؟ اگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالیے یا کمال اور ہری شنکر ہی میں کیا برائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے حد منفرد ہستی ہوں۔“ اس نے ذرا اٹکسار سے اضافہ کیا، پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”نہیں، چمپا باجی مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایت، بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت، گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کی روایت، دکشی، کشش، جذب دل۔۔۔۔۔۔ مگر خالی دکشی کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔“

”پڑھاتی جو ہوں۔“ چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زہر بکتر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی، پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابل افسوس معلوم ہوئی۔ ”اب ہر ایک تو کلاکار نہیں بن سکتا“ اس نے با آواز بلند کہا۔

”کلا کار نہ بنے۔ آج کل کلا کاروں کی تو فوج کی فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بنیادی کام کیجئے۔ اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔“ اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔ ”آپ کو نظر نہیں آتا؟“

”نظر آتا ہے“ چمپا نے کہا، ”لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں ت و تین سو روپے مہینے کے ملتے ہیں، میرے ابا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں، میں تم رئیس زادوں کی طرح خالی غربت کی تھیوری سے واقف نہیں، مجھے تنگ دستی کی حقیقت معلوم ہے۔“

کسی اور موقع پر اسے یہ گفتگو کرتے شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جاسکتی تھی!

”اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ وائٹس ناچیں گی اور رائڈنگ کے لیے جائیں گی؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

و کیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں؟ کس قدر ایلی منٹری باتیں کرتے ہو، جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو۔ ایسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنویں مجھے زمانہ گزر گیا ہے۔“

”تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پر اہم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چمپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔“

”انڈرگریجویٹ باتیں مت کرو۔“ چمپا نے غصے سے کہا۔

”انڈرگریجویٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھیا صاحب سے لوگائے بیٹھی رہیں۔ بتائیے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر پسند کیوں ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا اور اسے سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

”اچھا، آپ کو اچھی شکلیں پسند آتی ہیں؟ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!“ پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیٹ ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بھنویں اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگے۔ ”مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بد صورت نہیں۔“

”شاننا تم سے اتم عشق نہیں کرتی؟“

اب گوتم اپنی جگہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا ہے۔

”گوتم بہادر، تم بھی شیشے کے گھروں میں رہتے ہو، دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔“

”تم کو شاننا کے متعلق کیا معلوم ہے؟“

”تم اس کو چاہتے نہیں ہو؟ جو کوئی بھی وہ ہے، جو تمہارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ ہم کس کو نا صح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں؟ اور اب تم اس اپنی شاننا ٹیلر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔ بہت دنوں سے تم نے اس کو خط لکھ کر یہاں کی رپورٹ نہیں بھیجی، وہ تمہاری ذہنی رفیق ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کر

سکتے۔ تم کسی سے بھی شادی نہیں کر سکو گے۔ نرملا سے بھی نہیں۔ گو تم بہادر یہ بڑے اوق معاملات ہیں۔ یہاں تمہارے نظریے نہیں چل سکتے۔ میں بھی صاحب کو پسند کرتی ہوں۔ ان سے میری کوئی ذہنی رفاقت نہیں مگر گو تم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔ بتاؤ اس کا کیا کیا جائے؟ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔ کیا میں فطرتاً فلرٹ ہوں؟ ہرگز نہیں۔ ذرا باہر جا کر پوچھو میری کس قدر عمدہ ریپوٹیشن ہے۔ مجھے دینی کہا جاتا ہے۔ یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیویشن کیا تو اس لیے کہ تمہارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اسے تم نے افسوس خود ہی مسمار کر دیا۔ کچھ دن اور ثابت رہ لینے دیتے اسے۔ بڑا خوبصورت تھا۔ بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی موتی براجمان تھی۔ سارنا تھ سے واقفیت ہے؟ سارنا تھ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے اداسی سے بات ختم کی۔

اندھیرے میں وہ جس کشتی پر سوار تھا وہ کشتی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی وہ درتے چپے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کیسا پیارا لڑکا تھا اس میں ہری شکر اور کمال کی کس قدر مشابہت تھی ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان۔ یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اپنے جیسے کروک دستیاب کراتے تھے۔ اسی کو دیکھو۔ جنے کہاں سے بہتا بہاتا آگیا۔ یا تھا کسی دیس سے اک ہنس بے چارہ۔۔۔۔۔ سلسلہ روز شب، نقش گر حادثات۔۔۔۔۔ نقش گر حادثات۔۔۔۔۔ نقش گر۔۔۔۔۔ وہ اپنے

ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تاکہ اس جذباتی لینڈ سلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

”تم کو شائننا کے متعلق کیا معلوم ہے؟“ گوتم نے درتچے میں کھڑے کھڑے غرا کر پوچھا، وہ اس سے لڑ رہا تھا، یعنی اتنا نزدیک آپکا تھا کہ اسے ڈانٹے، اسے برا بھلا کہے اور اس سے لڑے، اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اس کر دیا۔

”گوتم!“ اس نے کہا، ”اس خوفناک پٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا مگر یہ کہ ہم سب کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے، وہ نیم تاریکی، وہ دھندلکا تم کو کہیں نہ ملے گا۔ جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو۔ جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تیز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آرا پار دیکھ رہے ہو لیکن میں تم کو خود آرا پار دیکھ رہی ہوں، اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے۔“

”_____ آرا پار دیکھ رہا ہوں۔_____ چمپا الفاظ کو ختم کر دو۔_____ الفاظ ہمیں کھا جائیں گے۔“

”الفاظ کو ختم کرو مگر معنی کے معنی موجود رہیں گے۔ بتلاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ چمپا نے بڑے بیسی سے کہا۔

بھیا صاحب کے لاشعور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا، البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے انہوں نے بالکل مون برت رکھ لیا۔ پہلے ہی وہ کون سی بات کر کے دیتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔

”بھیا صاحب کو خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔“ حمید بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

”واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جو تا چھپا ہوا ہے۔ لاجول ولا قوۃ طلعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورژوا رو مانیت نے ہر طرف اودھم مچا رکھا تھا، خود حمید بانو ان دنوں بڑے زوروں پر شاعری کر رہی تھی۔ موضوع سخن ایک مبہم سا اور اس قدر مثالی کر دیا تھا جو شاید یونانی دیو مالا کے لیے بھی تخلیق نہ کیا ہوگا۔

”ہمیں اس بورژوا ذہنیت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جاگیر دارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی۔“ طلعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا۔

”اور ذرا سننا۔ قسم خدا کی۔ دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن مرٹکیں کٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے۔“ سناتم نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف۔ ی گوتم سے جلتے ہیں۔“ طلعت نے ایک روز نرملا کو خبر دی۔

”گوتم سے _____ ہائے رے۔ یہ تو بڑا لطیفہ ہے۔ کون جلے گا اس بے چارے سے۔ اس قدر تو وہ Defenceless ہے۔“

”اے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں۔“ طلعت نے کہا، ”ہاں ہاں اور
کیا _____ مطلب یہ کہ وہ تو _____ حد ہے بھئی۔“

ٹھگوں کی منڈلی کی مانند ان سب کو اپنی منڈلی سے شدت کی وفاداری تھی۔
جو اس میں شامل ہو باقی سب اس پر جان چھڑکنے کو تیار۔
”مگر کیا چمپا باجی تو کہیں۔“ نرملا نے دفعتاً سوچ کر کہا۔
”ہشت ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔“

”اس میں بچپنا کیا ہے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔“ نرملا نے بے حد بزرگی
سے کہا۔

”غلط۔“ طلعت نے پر زور احتجاج کیا، ”چمپا باجی اب ایسی بھی ام میچور نہیں
_____ اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق؟“ اس نے خوفناک طریقے سے پوچھا۔
”گوتم سے؟ حد ہو گئی اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی
عشق کرنے کے لئے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہیے۔“

”اور اسی اسرار اور دھند لکے کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے
ہیں۔“ طلعت نے کہا۔ ”اور کیا۔“ نرملا نے صا د کیا۔

”دراصل چمپا باجی کے اس مسلسل عشق نے ہم سب کی سائیکولوجی خراب کر
دی ہے۔ غضب خدا کا۔ جب سے وہ یہاں آئی ہیں _____ یاد ہے ہم لوگ
فرسٹ ایر میں تھے _____ تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ کس قدر تھرڈ کلاس
بات۔“

”بے حد تھرڈ کلاس۔“ نرملا نے دوبارہ صا د کیا۔

”اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کریوں نہیں لیتیں شادی۔“

شام کا اندھیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے تھے۔ کشتی میں بیٹھا کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طلعت نے غور سے سننا چاہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات سمجھ میں آ گئی۔ دور گیت گایا جا رہا ہو اور فاصلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے، وہ سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ ”آؤ ترپ چال کھیلیں۔“ اس نے ہری شکر سے کہا۔

”بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے۔“ اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بتایا۔ ”پھر وہی قصہ۔“ طلعت نے بور ہو کر سوچا۔

”وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا لٹ کیوں دے رکھا ہے، ہر سے یہاں گھسارہتا ہے۔“

”ماشاء اللہ سے۔“ طلعت نے کہا۔ ”کیا یہ ہمارے گارجین ہیں۔“

”اب بہر حال _____ بڑے بھائی تو ہیں۔“ ہری شکر نے طرف داری کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا سے وفاداری، گوتم نیلمبر سے وفاداری۔ غریب شکر سر یو استوا کرے تو کیا کرے۔

”اور چمپا باجی کہاں ہیں۔“

”وہ تو کل سے ہسٹری کانگریس کے لیے الہ آبادی گئی ہوئی ہیں۔“

اتنے میں سائیکل آن کرر کی اور گوتم نیلمبر آ موجود ہوا۔

”چمپا نہیں ہیں؟“ اس نے آتے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

”نہیں، مگر ہم لوگ تو موجود ہیں۔۔۔۔۔ آؤ بیٹھو۔“

”یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا۔“

”اب کہاں جاتے ہو“ طلعت نے پوچھا۔

”یہی ذرا ولایت تک۔ اخبار بھیج رہا ہے۔ یہ سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں

ٹک گیا تو ساتھ کچھ پڑھ بھی لوں۔ بہت وقت برباد کیا ہے۔“

”یہی ذرا ولایت تک۔“ طلعت نے نقل اتاری۔ ”کس قدر کارعب ڈال

رہے ہیں جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جا ہی نہیں سکتے۔ چلو تم، ہم سب آتے ہیں

پچھے پچھے۔۔۔۔۔“

”کیا وہاں بھی منڈلی سے چھکارا نہیں ملے گا، اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر

منسوخ، بندہ جاپان کا رخ کرے گا۔“

”ہم جاپان بھی آئیں گے۔“

”قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے!“

”ظاہر ہے پہلے ہی تمہاری شامت آئی تھی تو شہر کا رخ تم نے کیا، اب بھگتو۔“

”ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاوے کی طرح غائب ہو

جاتی ہیں۔“

”ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو، تمہارا دیہانت تو نہیں ہو رہا پھر مل

لینا۔۔۔۔۔ شکر نے کہا۔“

”ہسٹری کانگریس کب ختم ہو رہی ہے۔“

”ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں، مگر اس کے بعد دسہرہ ہے، وہ سیدھی بنارس چلی

جائیں گی۔“

”یہ ہسٹری کانگریسوں میں جانے لگی ہیں؟“

”اور کیا۔ اتنی قابل جو ہیں۔“

”یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”ہاں۔ یار افسوس تو ہونا ہی چاہیے، میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔“

”طلعت ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر نرملہ کے پاس چلی گئی۔

”گرو جا رہا یہ۔“ اس نے کہا۔

”میں نے سنا بھی۔“ وہ رو رہی تھی۔ طلعت حیران رہ گئی۔

”اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔ روتی کیوں ہے؟ شادی کر کے تو بھی

ساتھ چلی جا۔ تیرا تو اس کے لیے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے۔“

”وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی۔ چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔ عمر بھر میرا مقابلہ

ان سے کرتا رہے گا۔ میں چمپا باجی کی پرچھائیں بن کر جیوں گی؟“

”چمپا باجی۔۔۔ چمپا باجی تم سے زیادہ برا کون ہوگا؟ اب جانے تم اور کس

کس کی قسمت برباد کرو گی۔“ طلعت دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ ”مت روائے مہا

بیوقوف۔“ اس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا۔ برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے

قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

طلعت چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

یہ گوگل بے حد خوبصورت جگہ ہے مدھوماتی ہوا میں جھولتی ہے پروائی کے
 جھونکے بچوں کی طرح کنج میں کلاکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ پھول ماں کی سوچ
 کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوگل، یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمہارے
 ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبے سورج کے مانند جگمگاتا ہے۔ کل اس نے کہا تھا اور
 میں، کمزور عورت، مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری
 کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاٹ پر
 پانی پھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اٹھتی ہے: ہری۔۔۔۔۔!
 ہری۔۔۔۔۔!! ایک لڑکی رو رہی ہے: گوپالا۔۔۔۔۔ وہ کہتی ہے۔ زندگی
 میں اس کی وجہ سے راحت ہے، زندگی میں اس کی وجہ سے اتھاہ دکھ ہے۔

ورندا بن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی
 گاگریں دھندلکے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ سبز گھاس کی گرم
 گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی
 ہے۔ رات کو ستارے ورندا بن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں
 کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم اوم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون
 لہریں مار رہا ہے، جیسے چاندنی کی لہریں جمنار پھیل جاتی ہیں۔ رنگ۔۔۔۔۔ روشنی
 ۔۔۔۔۔ موسیقی، کرشنا! کرشنا، موہن، ہری، نند لالہ، کانہا۔۔۔۔۔ اس کا ہر نام اس
 الوہی راگ کے نئے سر کی طرح بجاتا چلا جا رہا ہے، وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس
 سے محبت کرتے ہیں۔

اور یکا یک سنہری موسیقی کی بو چھاڑ میرے کانوں پر آن گری جیسے ہر سر کے

اس نے کہا۔۔۔ اویو قوف گوپیو۔۔۔ تم جو پانچوں حواسوں کے جھیلے میں گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کہ ہر شے فریب نظر ہے، ایک مکمل ورنہ ابن جس میں ہیں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں۔ درخت کے پھول نارنجی قمقموں کی مانند جگمگا رہے تھے اور رادھا کلی کا گچھا اس کی کافی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھنکی روح کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلما رہی تھیں؛ وہ سدا ہی میں کھو گیا اور اس کے بجگتے ہی شاخیں دوبارہ سرسرا ئیں، ستارے چمکے، ہوائیں بہنے لگیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی سدا ہی میں کھو گئی تھی۔

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی:

مرامی _____ تنیوں دنیاؤں کے نور _____ ہے ہے کرشنا

کچھ کو تو اپنے حسن سے اپنی اور کھینچتا ہے

کچھ کو بانسری کی آواز سے

کچھ کو تو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ بناتا ہے]

کچھ کو اپنے قہر و غضب سے متاثر کرتا ہے۔ گویوں نے کہا

کچھ کو تو میدان جنگ میں نیست و نابود کرتا ہے۔

کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے۔ گویوں نے کہا۔

مگر تیرا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔

جے کرشنا۔ جے جے کرشنا

اوم شانتی! شانتی! شانتی!!!

_____ موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ چمپا چونک اٹھی۔ اندھیرے

کمرے میں صرف ریڈیو کا ڈائل روشن تھا۔ ”ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف ‘گوپی کے دل‘ کا ترجمہ آپ نے سنا۔ اب آپ کماری گیان وتی بھٹناگر سے چند کونسل کا۔“ طلعت کی آواز آرہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سیٹ بند کر دیا۔

[illegible]

یہ کیا ہے؟ میں ڈائیکٹنگ میں اس کا ح ڈھونڈوں گی۔

اور محبت

“خداوند _____!”

جے جے کرشنا۔ بنت بناؤں بن ناہیں آوے ہری کے بنا۔۔۔۔۔ ہری کے
 بنا۔۔۔۔۔ برابر کے کمرے میں کوئی لڑکی پوری کا خیال گارہی تھی۔

وَفِعْتُ اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آگیا۔۔۔۔۔ محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ سوشل روم میں پیانو بجایا جا رہا تھا، ہر طرف

لڑیں گے۔“ گوتم آہستہ آہستہ بڑی گنبھر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر چمپا کو دیکھا بھی نہیں، وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

”لیکن ڈائریکٹ ایکشن۔“ کسی نے جوش سے کہا۔

”بکو اس مت کرو۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم اب یہ کیا ہو رہا ہے۔“ کسی اور نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ میرے لیڈر _____ اس کا حلق سوکھ گیا۔

”ہاں ہاں۔ تمہارے لیڈر _____ بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی تھیں۔ زیندر نے کہا۔

”یہ غلط ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا، اس نے گوتم کی طرف دیکھا لیکن گوتم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”اگر غلب ہے تو کل اخبار میں بیان دو گی؟ بتاؤ۔“ زیندر نے گرج کر کہا۔
”چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو _____ وہاں بیٹھ کر طے کریں گے۔“

”طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھانسی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔“ چمپا نے تلخی سے کہا۔

مجموعے نے اسے گھور کر دیکھا۔

”رشیدہ آپا کے یہاں چلو۔“

”رشدہ آپا کیا کر لیں گی اور تم۔“ ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بلیک چہرے تھے) ہری شکر کی طرف مڑا۔ ”بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے تھے بے چارے۔ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔“ وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

”اب خالی امن کی اپیلیں پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے؟“

”ہم نہیں لڑیں گے۔“ گوتم نے دہرایا۔

”ہونہہ۔ گاندھی دادیوں سے زیادہ بڑا فراڈ کہیں نہیں دیکھا۔“ تیسرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوٹل میں یونین کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا، وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چپیل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں ”جنگلی بچ“ کی ریہرسل کی جارہی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لیے ریسپور اٹھایا۔ ”کون ہے؟“ گوتم کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

”ہلو۔ میں نے سوچا تم سے بات کر لوں۔“

”کیا بات۔“ گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

”تم۔ تم بھی سمجھتے ہو کہ میں ری ایکشنری ہوں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتا چپا رانی۔ یہ وقت ذاتی مسائل اور الجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے، اگر تم اپنے مسائل کے باوجود دھارے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو

تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“
ہم _____ گوتم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا، وہ پھر تنہا تھی۔
”لیکن میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔“

”میرے ساتھ؟“

”ہاں“

وہ بڑا متعجب ہوا۔ ”چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔“
چمپا کو بڑا سخت صدمہ ہوا، وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔
”گوتم نیلمبر تمہارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں کہہ رہی
ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لیے کلکتے جا رہے ہو کل، میں بھی ساتھ چلنا چاہتی
ہوں۔“

”کہاں ماری ماری پھر وگی؟ جان کا خطرہ الگ ہے! اور تمہارے ابا بنارس سٹی
مسلم لیگ کے صدر ہیں، کیوں ان کا نام ڈبوئی ہو۔“
”تم بھی مجھے طعنے دینے شروع کیے۔“

”میں نے بھی!! کیوں، مجھ میں کوئی خصوصیت ہے؟ میں اور سب کی طرح
ہوں، ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھ لو _____ سنگھ بڑی چیز ہے اور آخری
حقیقت ہے۔ تنہا فرد واحد کی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے
پاس کوئی علاج نہیں۔“

”تم نے پھر نظریاتی بحث شروع کر دی۔ اچھا، شب بخیر گوتم _____“ چمپا
نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پر کفن باندھ کر کلکتے روانہ ہو گیا۔
نرملہ طاعت تہینہ سب چلی گئیں، صرف وہ اکیلی رہ گئی۔
مہینے گزر گئے۔

گروہ کلکتے کے بعد اب بنگال اور بہار کی سارے علاقے میں امن امن کی
رٹ لگاتا پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر وہ رگھوپتی راگھو راجہ رام
الاپتے، دن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ لڑکیاں واپس آ چکی تھیں۔ لکھنؤ کی
زندگی معمول کے مطابق جارہی تھی۔ مزید ڈرامے، مزید پارٹیاں، مزید کانفرنسیں۔
ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں پھلگو ندی کے کنارے بلوائیوں نے
چند ورکرز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں کمال اور شنکر اور گوتم بھی شامل
تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائیکل اٹھائی اور گلشن شاہ روانہ ہو گئی۔ پھانک پر سے اس
نے دیکھا کہ اسٹیشن ویگن میں سامان لد رہا ہے۔ تہینہ اور طاعت اور نرملہ سفر کے
لیے تیار کھڑی ہیں۔ میاں قدر گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع
دو تین روز پرانی تھی۔ تہینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت
گیا میں موجود تھے۔ اور ان تینوں کو موٹر پر لاد کر گورکھ پور لے گئے جہاں کے وہ
سول سرجن تھے اور اب وہ تینوں بھی گورکھ پور جا رہی تھیں۔

”خیریت سے ہیں وہ لوگ۔“ چمپا نے تشویش سے پوچھا۔

”گوتم کی آواز تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرنک کال کیا تھا۔“

”حالانکہ چوٹ سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے، چاچا کہہ رہے تھے فون پر۔“

”نرملہ نے اضافہ کیا۔“

”چمپا تم بھی چلو۔“ تہمینہ نے کہا، وہ مصروفیت سے جھکی اور اٹھی کیس بند کر رہی تھی۔

”تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم سمجھے بہت مصروف ہو۔“

”میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجاتی ہوں، ووائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہو سکتی ہے۔“

”کالج تو بند ہے تمہارا، چلو ہمارے ساتھ چلو، ہم واپسی میں تم کو بنارس چھوڑتے آئیں گے۔“ تہینہ نے کہا۔

چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سرجن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گارہے تھے۔۔۔۔۔ لوچلو ہے نا گوری۔۔۔۔۔ جول پائے گوری دھامے۔۔۔۔۔ تینوں بہت زخمی ہوئے تھے۔

لیکن بے حد ہشاش تھے۔ دن بھر وہ پڑے دنیا بھر کے گانے گایا کرتے: اپنا کے گیت، بنگالی کورسور، جستھانی اور کجراتی لوک گیت، فلمی گانے۔ لڑکیاں پہنچ گئیں تو اب دن بھر رمی کھیلی جاتی۔ شکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان لوگوں کے نزدیک نہ آنے پائے، ریڈیو کی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے اہتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کر لاتی۔ گوتم روزخبروں کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ ”پتا نہیں میں اپنی یہ تین انگلیاں استعمال کر سکوں گا یا نہیں۔“ وہ بعض دفعہ اداسی سے کہتا۔ ”چمپا“ ایک روز اس نے چلا کر کہا، ”ذرا سوچ سکتی ہو کہ اب

میں پیا نو کبھی نہیں بجا سکوں گا“

”کیوں نہیں بجا سکے؟ یا ر مور بڈ نہ بنو۔ کیا ڈریا مہ کھیل رہے ہو۔“ کمال نے کہا، اس کی اپنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

”اب بہر حال کیا ہو سکتا ہے۔“

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔
”چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں، جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔“ کمال نے کہا
کمال کو اب چپ لگ گئی تھی، وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراقبے میں چلا جاتا مگر گوتم کو مور بڈ نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

”ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہیں، ہم مرزا پور بھی جائیں گے جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔“

”مرزا پور میں اور ن ٹھون رن کاشی ہمارو گھاٹ _____“ گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا، وہ اداسی سے مسکرائی۔

یہ علاقہ بڑا دلفریب تھا۔ سربز اور پرسکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔ معصوم اور پر امن۔ رام دیا اور رام اوتار اور کدیر اور کمرن کا دیس۔ یہاں چاروں طرف جولا ہوں اور ٹھا کروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حویلیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گن اسٹیشن پر گاڑی رکی، یہاں ہری شنکر کی موسی ڈھیروں پھل پھاری اور ناشرے کے انبار لے کر

پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

”یہاں سے ذرا آگے کیل وستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں۔“ چپا نے تجویز کیا۔

”میں ایک زمانے میں بدھٹ تھا بڑا بھاری“ کمال نے اداسی سے کہا۔
”کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھرو گی چپا بیگم۔“ گوتم نے اکتا
ئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہت لمبا سفر باٹے۔“ شکر کی موسیٰ نے کہا۔ ”یہاں موٹر نہیں ملت
ہے۔“

وہ خود بہلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لیے ملتے
تھے۔ ترائی کے ہاتھی وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر کیل سو تو پہنچے گاؤں والے
ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دور ہماوت کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھلما رہی تھیں۔ چاروں اور سرخ
چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کیل وستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمال بڑا
تندہی سے ایک پتھر کو رو مال سے صاف کرنے لگا، اس پر لکھا تھا:

”مہاراجہ پیاداس نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال بہ نفس نفیس یہاں آ کر
عبادت کی کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا
اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگوار می معاف کی جاتی ہے۔“

اب یہاں وہ کنول کے تالاب اور سنہرے ہرنوں کی ڈاریں اور درختوں کے

کنج اور چنبیلی کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں؟ چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا، وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑ راتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی ماما دیوی کے محلات سرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آرہے تھے۔ قریب روہنی ندی اس سکون سے گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں۔

”یار بڑا سناٹا ہے۔“ کمال نے یکنخت گھبرا کر کہا۔

”بڑا شدید سناٹا ہے۔“ ہری شکر نے جواب دیا۔ ”چلو اب واپس چلیں۔ ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔“

گوتم نے کیمرہ اتر کر ہاتھ میں لے لیا۔ ”دن کا وقت تو تصویریں ہی کھینچتا۔“ اس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔

”شکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے۔ تاریخ ہمیں برابر دھوکہ دیتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔“ شکر نے حسب معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف آئے، ان کے سائے چاندنی میں مہارانی ماما دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب لگے۔

والپسی میں چمپا بنارس اتر گئی۔ کینڈونمنٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ درگا پو جا اور رام لیا! کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا اس نے اپنے شہر پر نظر ڈالی: تنیشور _____ اس نے کہا۔ ابدی کاشی _____ کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دور سے اپنے گھر کا چھوٹا سا پھانک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی جس طرح اندھیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتے کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چو طرفہ نل مچ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھٹے تھے۔ اندر تخت پر میرا سنیں چڑھی بیٹھی تھیں وہ جا کر ایک نیم تاریک صحنی میں کھرے پلنگ پر لیٹ گئی جس کی پانچویں کسی مہمان بی بی کا بچہ دالائی میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ دالان میں سے بوا حسین باندی کی پارٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی:

اس نے کہا: تو کون ہے؟

میں نے کہا: شیدا ترا

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سودا ترا

آنگن کی دیوار پہر عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزاں رہے کسی نے زور سے آفتاب چوکی پر رکھا۔ صحنی میں کوئی بچی سوتے میں روئی۔

میرا سنوں نے گانا گایا:

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سودا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دہراتی رہی، پھر ایک نوجوان میرا سن نے
گانا شروع کیا: اڑیا پر چور، بھوجی دیا تو جلاؤ، پھر سمندر ہنوں کی گالیاں شروع
ہوئیں۔ اس کے بعد سہاگ گایا گیا، وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سنتی
رہی۔ باورچی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی
کالونچ تھی اور بھگاری مہک۔

گھر گھر اپنا گھر۔

پھر رات کا سناٹا چھایا اور ایک بیل گاڑھی کھڑکی کے نیچے سڑک پر چرخ چوں
کرتی گزری۔ اس کے پہیوں سے وہ عجیب و غریب سمع خراش آواز نکل رہی تھی،
اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ گنگا پار اپنے نانا کے گاؤں شیم پور جایا کرتی تھی تو ایک
مرتبہ رسولن مہری نے کہا تھا: جانو جئے ای گاڑی ما سے اسی آواز نکلی جانو بھوانی خفا
ہوئیں۔ براشگون ہو۔ بہتے براشگون۔

دفعۃً اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والے ہے؟ اور اس کے منطقی
وجود نے اسے سمجھایا: کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں
مچا ہے کہ۔ مگر کمال کی انالس تو یہ ہے۔ اونہہ کمال کو مارو
گولی۔ کیا اس کی انالس صحیح ترین ہے اور یہ کیونسٹ کیا کہتے
ہیں۔ ہونہہ ان کی بھلی چلائی۔ سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا
فلسفہ کمال کا جوش و خروش، طلعت کی تیز گفتاری، تہینہ کی پرسکون شخصیت
سب ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی؟ کیا

تھی؟ اس کو لوگ کیا سمجھتے تھے؟ گوتم اس کو کیا سمجھتا تھا؟ گوتم کی رائے اس قدر عزیز
کیوں ہے؟ جنم میں گیا وہ _____ اور عامر رضا _____ عامر رضا _____
صبح کو وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ سروپ نکھا کی ناک کٹی۔ راون جلا۔ بھرت ملاپ ہوا۔
دبلے پتلے لڑکے منہ پر سیروں غازہ اور سفید پوتے، پنی کے نپلی تاج پہنے، رام اور
پچھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تخت رواں پر سوار ہوئے۔ انسانوں کو ان میں خدا
کا جلوہ نظر آیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنواپس آگئی۔ زندگی جاری رہی، پھر کوار
کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیپ مالیکا نے روشن کر دیا چھوٹی اور بڑی
دیوالی منائی گئی۔ گھر گھر لکشمی کی تقدیس کی گئی۔ آج لوتکا چماری کی عملداری ہے۔
گلنشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہار خیال کیا۔ بچو! ہر مارے مارے
مت پھرو۔ آج کی رات جانے کتنے جادو ٹوٹے ہوں گے؟ سامنے چوراہے پر
ایک دو نے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔ جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔
یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہنڈیا اڑتی ہوئی آئی تھی اور ہماری احاطے میں گری تھی۔
طلعت نے کہا وہ گھاس پر آکر آسمان کو دیکھنے لگے۔ آج کی رات لکشمی اپنی سواری
کے الو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔ جانے وہ کس کس کے
دروازے میں داخلہ ہوگی۔

”باہر گھاس پر مت جانا بچو۔“ خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی۔ ”برسات کا سانپ
دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔“

جلہ جلہ چوراہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔ رام اوتا را اور قدیر جوا کھیلنے گئے۔

(ارے اگر آج جو نہ کھلیا تو اگلے جنم میں چھوہندر کی جون ملے گی رام اوتار نے کہا) پھر بھیا دوج کا تہوار آیا۔ ہری شکر قالین پر چڑھایا بیٹھا تھا اور نرملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے سامنے مٹھائی پر وس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے۔ اس نے منتر دہرایا پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتر چڑھا دیے۔ گاؤں میں نوٹکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہا بھارت کے قصے دہرائے گئے۔ سفید انگلی ساریاں پہنے عیسائی عورتیں گاتی پھریں: اوہ مسیح آیا سر آسمان۔۔۔ سر آسمان سر آسمان۔۔۔ کچھڑی کا تہوار آیا تو لوگ ماگھ میلانہا نے تر بنی چلے۔ بسنت پنچمی میں گھر گھر سرسوتی پوجا کی گئی۔۔۔ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دہی سفید ساری پہنے سفید کنول پر بیٹھی شفاف الوہی پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کمہاروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا، پھر پھاگن کی رت آئی۔ شورا تری کی تیاریاں کی گئیں۔ نرملا نے سنگھاڑے ولای کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں بلوا کی پیتاں دھتورہ اور چاول تھالی میں رکھ کر شو کی آرتی اتاری۔ محرم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور موم ارکاغذ کے تعزیے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صناعی ان پر ختم کر دی۔ ان کاغذ اور پنی اور ریشم کے گہواروں، تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چراغاں ہوا۔ گلی کو چوں سے پیلو اور سونی اور درگاہ نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضا نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا ہر شخص حسین کا سوگوار بنا۔ (سبطین اباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیر نے چپا کا دامن پکڑ کر کہا: مولا کے نام

پر ایک ڈبل دیتی جائیے۔) شاہ نجف کے امام باڑے میں چراغاں کے روز حسب معمولی برقی قلموں سے بنے ہوئے حروف میں ”ہنرمیجھٹی کنگ غازی الدین حیدر“ کا نام جگمگایا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلاں اور غیر سے سرخ ہو گئی۔ کرشنا کی مورتی کو جھولوں میں بٹھالایا گیا۔ صبح بون فائز میں رکھشی ہو کا جلی۔ ہایارے سڑکوں پر کبیر گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکا تھا؛ ذہن کا فریب، طمر کا بہالوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے؛ جس قیمت پر ملے ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمہارے اصول، تمہاری جیل یا ترائیں، تمہاری کانگریس، تمہاری مسلم لیگ۔۔۔۔۔ سب کو اس ہے تم لوگ جو انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کروانے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہیے۔ گھر، سکون، بچے، شوہر کی محبت۔

تم کیا افسوسناک باتیں سوچ رہی ہو چمپا بیگم۔ شرم کرو۔۔۔ اس کی منطقی وجود نے جو کھڑکی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا، پلٹ کر اس سے کہا۔۔۔ شرم کرو۔۔۔ شرم کرو فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے بھی سناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے، ندی نالے جل سے بھر گئے، گوڑ ملہار کی تانوں میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا، یروانی کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاتی سرک یر آگئی۔ سامنے پروفیسر بنرجی

کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے۔ (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟ میں چمپا احمد جو یہاں تنہا کھڑی ہوں)۔ ڈرائنگ روم کے پردوں کے پچھلے وہ سب موجود تھے وہ آہستہ آہستہ چنبیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی درتپے کے نیچے آکر کھڑی ہو گئی اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور کمال بھی۔ گوتم نے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جا رہا تھا۔ کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے لندن بھیجا جا رہا تھا کہ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ ملازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطیاں پیچھا بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے۔

”ان کا خیال ٹھیک بھی ہے۔“ گوتم کہہ رہا تھا۔ ”پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے؟“

”بابا کیسے جاسکتے ہیں؟ زمینداری نہیں چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کر دیا ہے۔“ کمال نے جواب دیا۔

دلی، شملہ، نمبر ۱۔ اورنگ زیب روڈ، وائس رائل لاج، بھنگلی کو لونی _____ یہ الفاظ اس کے کانوں میں آتے رہے وہ درتپے سے ہٹ آئی اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آ گئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیائیں تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے، ان کے دل و دماغ، ان کے تصورات، ان کی جدوجہد۔۔۔۔۔ مگر یہاں مستقبل بے حد مبہم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مسرت۔۔۔۔۔ عامر رضا پاکستان جا رہے تھے۔ کیوں نہ جائیں، آخر وہ کمال کی طرح سر پھرے تھوڑے ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے؟ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مسرت ذاتی ترقی، ذاتی مقاصد، آخر کیوں نہیں۔ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لیے میں کیوں سوچوں؟ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا۔۔۔۔۔ میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی، کتنی آسان بات ہے۔ لکھت ایسا لگا جیسے بلر ختم ہو گیا، سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا۔ بیگم عامر رضا۔ کراچی۔۔۔۔۔ واہ بھی، مگر یہ لوگ کمبخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی تم کیک لو بھی اور اسے کھاؤ بھی۔ ناممکن ہے، وہ شاہی پھاٹک تک پہنچ گئی، اس کے پیچھے پیچھے گوتم آ رہا تھا۔

”چمپا باجی خدا حافظ“ اس نے کہا۔

”جاتے ہو ماسکو۔“

”ہاں۔“

”کمال کا کیا ہوا؟“

”وہ جا تو رہا ہے جولائی میں چلا جائے گا۔ طلعت اور نرملا بھی جا رہی ہیں، ان

سب کو کیمبرج میں داخل مل گیا ہے۔“

”بہت خوب۔“

”آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں، چمپا باجی۔ یہاں بیکا را پنا وقت گنوار ہی ہیں یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔“

وہ بادشاہ باغ کے پھانک کے پرانے گموں سے پیٹھ ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ گوتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ ”آخر تم بتاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

”آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دیگا، کون کس کا نا صحیح بن سکتا ہے۔ میں کمینہ نہیں ہوں چمپا باجی، محض حقیقت پرست ہوں۔“

”تمہارے پاس میرے لیے صرف یہی الفاظ ہیں؟“

”آپ تو الفاظ میں معنی نہیں دیکھنا چاہتیں، اس لیے کیا فرق پڑتا ہے، میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہوگا۔ خدا حافظ۔۔۔ گلفشاں جائیے تو اپنی کوتاہی دیکھیے گا میں صبح دلی روانہ ہو رہا ہوں۔“ وہ آگے طلا گیا۔

طلعت اور زملا باتیں کرتی قریب سے گزریں۔

”دل نہیں مانتا، ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں، حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری ہے۔۔۔ گویہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوئی نا۔“ طلعت کہہ رہی تھی۔

”بالکل۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے، اگر اب نہ گئے تو سمجھو کئی سال برباد گئے۔“ نرملانے جواب دیا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ دونوں بھی اسے بلو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔
اب کمال قریب سے گزرا۔

”چمپا باجی، مبارک ہو، تمہارا پاکستان بن گیا۔“ اس کے لہجے میں جس قدر تلخی، نفرت اور شکستہ دلی چھپی تھی اس کا احساس کر کے چپا لرز اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کمال ایک اور تقریر کرے گا، اسے برا بھلا کہے گا مگر یہ کیا ہوا کہ کمال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے، سنسنے، خفا ہونے، بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا۔ اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی، فیصلے اور عمل کی منتظر کمال ایک لمحوے کے لیے خاموش کھڑا پھاٹک کو دیکھتا رہا۔ جس کے ایک اندھیرے طاقے میں چوکیداری کی لائین جل رہی تھی، اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔ وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیم تاریکی میں کھڑی رہی۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر چلے گئے، وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں، جو اس کے لیے اجنبی تھی مگر اس میں وہ موجود تھا۔ وہ جو اس کا ہاتھ تھامے گا، وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی میں رومان اور محبت اور گلاب کے شگوفوں کا وجود ہے کہ نہیں! انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے، وہ اس سے کہے گی: لو بھی میں یہاں ہوں۔ ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی

وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک چھاننے دو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ لو میں آن پہنچی۔ خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی جس کے تم سمبل ہو۔ (یہاں ہر چوز کا سمبل موجود ہے۔ ان لوگوں نے سمبلوں میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا)۔ مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

پھانک پر اسے رام اوتا ر ملا۔

”بھیا صاحب ہیں؟“ اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے، وہ چوروں کی مانند خوفزدہ ہے، وہ گلفشاں میں سیند لگانے آئی ہے۔

”بھیا صاحب تو ابھی ابھی چلے گئے۔“

”کہاں۔“

اب اندھیرے میں سے نکل کر گنگا دین بھی سامنے آ گیا۔

”کہاں چلے گئے بھیا صاحب؟“ چمپا نے دہرایا

”وہیں۔۔۔۔۔“ رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا، ”مسلمانوں کے

پاکستان۔ اب آپ بھی چلی جائیے گا۔ سب جنے چلے جائیں گے۔ ہم اکیلے رہ جہیں۔۔۔۔۔“

گنگا دین، رام اوتار کے قریب آ گیا، وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی تھا اور روز ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بھیا صاحب بڑے بے و پھا نکلے۔ چمپا بیٹا کو چھوڑ کر چلے گئے چپے سے۔ انہوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔ بھیا صاحب نے گنگا دین سے دغا کی۔ بڑی بے و پھا بے مروت قوم ہے۔۔۔۔۔ اسے صبح کا ہندی اخبار کا

اڈیوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا۔

بھیا صاحب بمبئی گئے ہیں۔۔۔۔۔ ہواں جہا جن کا ہٹوارہ ہوت ہے۔
اپنے مسلمانی جہا ج لے کر کراچی چلے جنہیں۔ کدیر بتاوت رہے۔“ رام اوتار نے
اطلاع دی، ”ہو۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔“ اس نے
طوطوں کو اڑانے کے لیے پھلوں کے درختوں پر ایک پتھر پھینکا۔

گنا گادین اور ترام اوتار کو اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ واپس لوٹی۔ بھیا
صاحب چلے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موٹروں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان
کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی: نیا ملک، نیا عہدہ، ترقی، نئے مسائل۔
مردوں کی دنیا نئیں بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

”اس آدمی کے لیے میں نے اتنا وقت برباد کیا؟ ارے میں کتنی مور کھتی۔“
پھر اسے احساس ہوا، ساری بات یہ تھی کہ بھیا صاحب بے حد خوبصورت تھے
اور اس نے بھیا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے
میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں
_____ سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلنشاں کا لان جس کے سر
ے پر یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصاحیس: کمال، گنا گادین، ان
کا خاندان۔ ان کی کزن تہینہ جو اندر بیٹھی ہوگی۔ وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیا
صاحب خوبصورت تھے۔ اور مغرور۔ ان کو غرور جانے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر
ہنسی آگئی۔ اس کا جی چاہا خوب ذوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو غرور ہوتا
کس بات پر ہے؟ اپنی شخصیت پر؟ شخصیت؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔

کمال کو اپنی اصول پرستی کا زعم ہے۔ تمہینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں؟ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آرہی ہے۔ ہواؤں میں آزادی تھی۔ پتیوں کی سرسراہٹ میں عجیب قسم کی طمانیت پنہاں تھی۔ محض میں ہی محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تمہینہ _____ اور _____ گوتم جو اپنے کزن کی بیوہ شانتا پر عاشق ہے۔

”ہا ہا ہا۔۔۔ ہاؤ فنی۔۔۔ اس نے دل میں کہا۔“

پھر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع، بھیگی خوشبو دار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گیلے راستے جن کے دونوں طرف اونچی باڑیاں تھیں، روشیں۔۔۔ گھاس جس پر سرخ بیر بہوٹیاں چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گہرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نمی اور خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے برساتی نالے کے برابر جو پگڈنڈی ایسی بن گئی تھی اسے الانگ کروہ برسوں دوسری لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سیگ زرتے اب بھی لڑکیوں کے پرے ہوٹل کی طرف جارہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کروہ پچھواڑے والی سڑک پر آگئی جدھر اسے ایک کچا راستہ سنگھاڑے والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹی لگی تھی۔ چاروں اور پھولوں کی بلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوطے شور مچا رہے تھے ہر چیز وہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

”کابات ہے بیٹا۔۔۔۔۔“ قمرن نے دفعتاً سامنے آکر پوچھا۔

”کچھ نہیں دربر کی بی بی۔“ اس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”ہم یہاں بیٹھ جائیں دربر کی بی بی۔“

”جی ہاں۔ آئیے۔ ضرور بیٹھئے۔۔۔۔۔ بارش آرہی ہے بیٹا

۔۔۔۔۔ اوسارے میں آجائیے۔“

وہ شاگرد پیشے کے برآمدے میں آگئی۔ برآمدے کا فرش خنک تھا۔ منڈیر پر برتن رکھے جگر جگر کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پرٹنگی تھی۔ چادر پر پاؤں پھیلے تھے۔

”پاؤں سکھائے خاطر تنگو گھام اونہیں ملت ہے۔“ قمرن نے بات شروع کی۔ اسے معلوم تھا کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سناٹا تھا۔ ”بیٹا آپ لوگ مننی کی طبیعت نہیں جانت ہیں ہم نیچ تو ای جانت ہن کی مننی جیسے خوش رہت ہے جب برابر او کی ٹہل کیے جاؤ او کے لیے اپنی زندگی تچ ڈالو۔ ویسے ای لوگ بے خوش ناہیں ہووت ہیں۔ ہم تہمانہ بیٹا کو کیسے سمجھائی کہ لڑکین کا اپنی اوکات پہچانے کا چاہی، وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن، وہ ان سے ایک ٹھو بات کیے بغیر ہی پاکستان چلے گئے۔ اب بیٹا صاحب رووت ہیں۔

چمپا خاموش رہی۔

”لڑکی کا اوکات ہے۔“ قمرن اداسی سے کہتی رہی۔ ”مہرا رو بن جائے تب

بھی مننی کی نوکر۔ مہتاری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو

بیاہ کر لائے او کی دھونس الگ ہے۔۔۔ کا آپ ہو بلایت جارہی ہیں؟“
”ہا شاید۔“

”اچھا ہے۔ بیٹا۔ مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چین ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملیے
۔“

”بھیا صاحب نہ ہی کوئی اور رہی۔ سب مننی ایک سیت تھوڑا ہی ہوت ہیں
دریبر کی بی بی۔“ چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔ پروائی کا ایک جھونکا آیا۔ بارش کے
قطرے ٹپ ٹپ۔ چھر پر برس گئے۔

”سب مننی ایک سے ہوت ہیں بیٹا۔۔۔ قمرن نے کہا۔“ پان بنائی؟
”نہیں قمرن رہے دیو۔۔۔ اب ہم ہو چلیا۔“ چمپا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی
ہوئی اور چھتری سنبھال کی پگڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہو گئی۔
قمرن چھپر میں سے باہر آ کے اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔ ”ای بیٹیاں بات
کا ہے نہیں سمجھ پاوت ہیں۔“ اس نے چھٹکی رم دیا سے کہا
”بیٹیاں میں ہمت نہیں۔ ڈرت ہیں۔ سمجھت ہیں جھوڑا سا انگریجی پڑھ لیسین تو
دنیا جان گئیں۔ بیٹیاں میں ہمت نہیں۔“ چھٹکی نے سر ہلا کہا۔

طلعت طنبورہ اٹھا کر برآمدے میں آن بیٹھی۔ اس نے اب کے ساون گھر آ جا
’الا پنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ تہینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلاؤ

زسی رہی تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم جس طاری ہو گیا۔ طلعت اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست _____ طلعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل لوجیکل تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایکٹ اپنی حتمی شکل کو پہنچا، وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے _____ بھگوڑے کہیں کہ _____ وہ تہینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی۔ ”چمپا باجی نے بڑے خوبصورت کھن پیس خریدے ہیں۔“ اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہینہ نے سر اٹھا کر اسے اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پراسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوں گھوں کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئل مستقل کو او کیے جا رہی تھی، بہت دور سے رام اوتار کی آواز آرہی تھی۔ طلعت میں یکنخت خود اعتمادی واپس آگئی۔

”دراصل آپ یہ سب جذبات کی بات ہے۔ جذبات اور ذہنی ہمدردی اور ایکویشن“ اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ پر یقین آ گیا تھا۔

”اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔“ تہینہ نے اکتا کر کہا۔
”چار سو بیس؟“ طلعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا، ”آپی یہ اصلیت ہے۔“

پراہلمز کا مثلث بن جاتا ہے۔ تمہارا پراہلم _____ بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پراہلم _____ اور ان سب کا انٹرایکشن _____ یعنی کہ _____

تہینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم ڈاکٹریٹ کے لیے کیمرج جا رہی ہونا؟“

طلعت برا مان گئی، مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں، قسم خدا کی اپنی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔

”آپ کے نزدیک میں چغد ہوں؟“ اس نے دکھ سے پوچھا۔

”نہیں۔ تم بے حد عقلمند ہو _____ مگر عورت بھی ہو۔“

”اپنی _____“ طلعت دباڑی _____ ”اپنی تم نے حد کر دی، تم اس قدر بورژوا ہو گئیں، تم نے پڑھ لکھ کر گدھے پر لاد دیا۔“ اس کا جی چاہا اپنی کی ذہنیت پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ”ہائے اپنی۔“ اس نے تہینہ کو الماری میں سے رنگین دھاگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا، ”ارے تم تو موومنٹ میں شامل تھیں، تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے، وہ ۴۲ء کا واقعہ یاد نہیں جب دلی یونیورسٹی کا ماس گائیڈ آیا تھا اور تم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔ رشیدہ آپا کی تم لفٹس رہیں۔ کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کر ڈالیں۔ چمپا باجی جیسی ری ایکشنری کو تم نے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی اور اب تم عورت کا لیبل چپکا کر قانع ہو گئیں۔ ارے لڑو _____ کام کرو _____ بھیا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا؟ جہاں مرغا نہیں ہوتا وہاں سویرا نہ ہوگا؟ بھیا صاحب کی قوم کے سینکڑوں موجود ہیں اور یہ اسرار میرے پلے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اور اب بیٹھی روتی ہیں۔ جہنم میں جائیں بھیا صاحب۔ ارے ان کا دماغ بھی

تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نرملا بالکل ٹھیک کہتی ہے، مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے
 ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ ارے پوچھو، آپ ہیں کون چیز؟ نہ
 شکل نہ صورت۔ گورا رنگ، مولیٰ کا ایسا۔ ہر اٹیلین لوفراسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے
 ایسے کسی تین سو ساٹھ ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک
 عین تمہاری ناک کے نیچے چمپا باجی سے فلرٹ کیا کیے اور اب تشریف لے گئے تو
 بیٹھی چمکو پہکو روتی ہیں۔ ارے لکھائیں ایک جوتا بھی صاحب کی ناک پر
 ”_____“

”طلعت _____ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں، بدتمیزی مت کرو۔“
 ”ہاں اور کیا، اب اسی کی کسرہ گئی ہے کہ تم ان کی طرف ذاری بھی کرو۔ پر انوں
 میں یہی لکھا ہے، ہر پتی ورتا استری کا یہی دھرم ہے۔ لا حول ولاقوۃ۔ میں کہتی ہوں
 تم میں اور چھٹکی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز پٹتی ہے۔ حسینی
 کی بی بی نے کل اس کی ہمدردی میں رام اوتار کو برا بھلا کہا تو اے لو، وہ تو حسینی کی بی
 بی کی جان کو آگئی کہ خبردار جو میرے آدمی کو کچھ کہا۔“

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طلعت روہانسی ہو گئی۔ بھیا صاحب کے بجائے
 اسے اپنی پر غصہ تھا، اگر عمر میں بڑی نہ ہوتیں تو ان کی اتنی ٹھکانی کرتی کہ ساری
 وفاداری اور محبت اور بورژوا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی
 دل میں پیچ و تاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل
 اٹھا کر وہ نرملا کے گھر پہنچی، وہاں جا کر اس نے چند رکی بھجیا کھا کر پیا اور نرملا اور
 مانتی اور ہری شکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیل تیب جا کر اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا

ہوا۔

طلعت کے جانے کے بعد تہینہ مشین پر سے اٹھی اور درتپے میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا، اس نے دل میں کہا۔ ہوا میں طوفان لرز رہے ہیں اور گلفشاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں، ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈراما لکھا جائے تو کردار کی تشریح یوں ہوگی:

نواب زادی تہینہ بیگم، عمر پچیس سال۔ فرسٹ کلاس ایم اے
سانولی، دہلی، حساس، اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپنی کے نام سے پکارا
جاتا ہے۔ خلیق اور منکسر المزاج، مغرور۔ اس حقیر وضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ
جاتا ہے؟ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا:

دس سالہ کا وقفہ۔ تہینہ، جواب ذرا موٹی ہو گئی ہے۔ بچے کو گود میں لیے گنگنا رہی ہے: میں کھاؤں، مور بالا کھائے، بالے کا جھٹھا کود نہ کھائے۔ بالے کا
 --- چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آ گیا ہے۔ صبر اور سکون _____ لاحول ولا قوۃ _____ وہ برآمدے میں
 آ گئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ چبوترے پر بہت سے رشتے دار بچے ”کوڑا جمال
 چاہی“ کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سوسن، طلعت کی چیزیاں رنگ کر پھیلا
 رہی تھی۔ کمال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا، واہ کیا سہانا منظر ہے۔ دوپٹے
 رنگے جا رہے ہیں۔ اپنی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار
 خالائیں مصروف گفتگو ہیں، وہ بھی اندر آ کر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں
 حصہ لینے لگا۔ جی ہاں، چھوٹی خالہ ٹھیک کہت ہیں۔ ضرور پاکستان جائیے، وہاں

بڑے ٹھاٹھ رہیں گے، وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ تہینہ نے اسے درتے میں سے دیکھا، یہ سب ڈرامے کے کردار تھے جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اسٹیج پر دھند کا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آ گئی۔

کمال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھانا شروع کیا۔

”کوڑا جما شانی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی۔۔۔۔۔ پیچھے دیکھا
_____ اپنی _____“ اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ ”سل گئے بلاوز
_____ کوڑا جمال شانی _____“

تہینہ برآمدے کے ستون سے ٹک کر اسے ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کوڑا جمال شانی۔ اپنی چمپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں، بلکہ لے گئیں
تشریف _____ پیچھے دیکھا مار کھائی _____“
”کیا ہوا؟ کہاں؟“ تہینہ نے چونک کر پوچھا۔

”فرانس _____ کوڑا جمال شانی _____ اس نے زور سے ایک چھوٹی
سی بچی کو چنے ہوئے دوپٹے سے مارا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پیچھے
دوڑی۔“

”کیسے؟“ تہینہ نے آواز دی۔

”یونیورسٹی اسکا لرشپ _____“ کمال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے
گھومنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کمال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پر پھینک کر
باہر بھاگ گیا۔

سرک پر آ کر کمال نے کلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر

سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔ ستیل پانی بچھا کر وہ سب بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے طلعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہا شروع کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جو شفاف تھا، شرون کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی، اس میں خون ملا تھا۔ خون کی برکھارت، خون کی کچھڑ، خون برسانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طلعت عاجز آگئی۔ نرملا کی نئی کینوس کے قرمزی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی۔ (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا)۔ پھولوں پر خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نرملا اور ہری شکر کو دیکھا۔

۵۷

اور اب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا:

او جنار دھن! میرا تھ دونوں فوجوں کے درمیاں کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں

کے درمیان کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھاپ، دادا، چچا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، دوست، استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا: اور کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ اوکیشو! میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے برے شکون دکھائی دے رہے ہیں۔

او ما دھو! میں اپنے ہی کنبے اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحانیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور پرہوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ پرکھوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

او مدھو سوون! میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہئے یا انہیں ہمیں۔ او گوندا! میں نہیں لڑوں گا۔

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈ لی کے ٹیوپ اسٹیشن میں گھڑی کے نیچے، جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا، ٹھکانا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے دے سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے تھیر لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہر حال ضروری تھا۔ تنگ آ کر اس نے نیو سٹیمین! اینڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور امن کے مسئلے کے متعلق چھپا تھا سرل بیتاب تھا کہ سر لکھا کے گھر پہنچ کر اس پر پر دوستوں سے بحث کرے۔

سرل دوسرے لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے نے اس اسٹو کریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جو اب سٹی میں ربر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پردادا سرل ہاورڈ آپٹکل ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کلرک کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے کمائے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں انہوں نے خوب ہاتھ رنگے اور جو لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے

جواہرات شاہ اودھ نے ان کے تحفے میں دیئے وہ علیحدہ، وہ سکسی صوبے کے گورنر بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں ربر کی تجارت شروع کی، گاؤں اور محلات خریدے، لارڈ کا خطاب حاصل کیا، پارلیمنٹ میں بیٹھا اور باقاعدہ ارسٹو کریسی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لارڈ بارن فیلڈ تھا۔ اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔ اس کا بیٹا دوسرا لارڈ بارن فیلڈ ایمپائر کا اور بھی زیادہ قابل فخر فرزند ثابت ہوا اس نے برطانیہ کی فارن سروس میں بڑے بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کیے۔ کلکتے سے ایک کنزرویٹو اخبار نکالا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمد زکوا بہتہ وہ گوارا کر لیتا تھا جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن کلکتہ یا امپیریل ہوٹل دلی کی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے دادا ”باب“ سرل ایشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کے دادا باب سرل ایشلے فی الواقع بڑی رومینٹک ہستی رہے ہوں گے جو اردو میں شعر کہتے تھے اور مرغے لڑاتے تھے، کتھک ناچ دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ ان کی ایک تصویر رائل اکیڈمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی۔ جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے پیچوان گڑ گڑا رہے ہیں اور کالا بھنگ نیو ملازم پیچھے کھڑا مورچھل جھل رہا ہے۔ پس منظر میں تاڑکے پتے ہیں۔ یہ تصویر میز کے وسطی ہال میں لگی تھی۔

دوسرے لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دولڑکے تھے: بڑا لڑکا تیسرا لارڈ بارن فیلڈ خاندانی کاروبار اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا لڑکا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گردش میں تھا۔ ملایا میں ان کے ربہ کے جنگلات میں کمیونسٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماؤ ماؤ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی ملی تھی کلکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرق پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پرنٹ لگا کر پبلک کو اس کی سیر کراتے تھے۔ محل بیش قیمت نوادر سے پٹا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پر پارک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ چھوٹا بیٹا تھا لہذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی کمانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اس نے روزماری سے شادی کی تھی بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی ستھیا سے اس کا بیاہ رچائیں گے۔ چاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے۔ ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا۔ انگلستان کی ارسٹو کریسی کے بچے کچھ افراد کو چاہئے کہ اس نازک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل اس سر پھرے لڑکے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ لونڈا کمیونسٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس لڑکے کو

سیاست سے چنداں دلچسپی نہیں تھی، وہمت و خدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کا اس کو پائلٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پر جا کر بم گراتا تھا۔ جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روزمیری، جس سے اس نے شادی کی، متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجسمے بناتی تھی۔ بیت چاری کامیاب سنگتراش بھی نہیں تھی اس لیے سرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل ماہر فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری تھی، سرل نے سوچا۔ لہذا اس سے شادی کر لی اور لندن سے فون پر اپنے بھائی اور بھاونج کو مطلع کیا۔ لارڈ بارن فیلڈ نے فی الفور اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ ایک تو روزمیری گمنام اور مفلس، اوپر سے رومن کیتھولک۔ لارڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہو گئے، لیکن سرل نے پرواہ نہیں کی، وہ ہیگل کے مطالعے میں جٹا رہا۔ سرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفن ڈشائر کے چینی کے کھلونے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بڑا تعجب سا لگتا، پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روزمیری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چلنگ کا ٹکٹ خرید کر خود اپنے ”اسٹیپلی ہوم“ کی سیر کرنے کے لیے جا پہنچا۔ اس کے بھائی

اور بھاوج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اسٹاف کے لوگ محل کی سیر کر رہے تھے، وہ نئے لوگ تھے، کسی نے سرل کو نہیں پہچانا، وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا، کیسی عجیب بات ہے، میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سرل کا محل قصبے کے اختتام پر تھا۔ چار پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کمرے اور ہال اور غلام گردشیں۔ سرے پر ایڈی چیپل تھا۔ مارنگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور اطالوی سنگ مرمر کے مجسمے پھولوں میں ایستادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ ان باغات میں خالص کنٹری اسکوئر کی مانند ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے چہل قدمی کیا کرتا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارہویں صدی کی دو راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ان کے تابوت کی جگہ جو پختہ گڑھا سا بنا ہوا تھا اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے لڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گور کھدھندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہروالوں کے لیے اس محل کے چپے چپے میں افسانویت کی افراط تھی۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پر دادا و نانا ب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا

تھا۔ ڈبلیو ای۔ بیٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشا نیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلیجنٹوں کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح آزادی کو بڑے زبردست معنی پہنائے جاسکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اپنشدوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑا گ جوامراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پردادا نواب سرل ہاورڈ ہیشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ ڈبلیو۔ ای۔ بیٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشا نیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلیجنٹوں کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس

اصطلاح، آزادی، کو بڑے زبردست معنی پہنائے جاسکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر
پنسشدوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا۔ اس عہد کی ساری ذہنی الجھنوں،
روحانی نا آسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شبہوں کا شکار۔

رورنگ ٹونہیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ ۳۰ء سے ۳۹ء کے دور میں اس نے
ہوش سنبھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجمع رہتا
جو اس کی سوتیلی ماں ایڈی ایلن سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان
میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا
عجیب و غریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیس بازو والوں کا دور۔ بلومزبری والے
اینٹی فاشٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوئیس اور اسپنڈر ترقی پسندوں کے گرو بنے
ہوئے تھے۔ لندن کے یونٹی تھیٹر میں کمیونسٹوں کے ڈرامے ہوتے تھے۔ ویسٹ
مسٹر تھیٹر والے مک نیس اور اوڈن اور اشروڈ کی تمثیلیں اسٹیج کر رہے تھے۔ بائیس
بازو سے تعلق رکھنا ذہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسنفر ووڈ اور سیڈرک مورس اور بن
نکلسن کی پینٹنگ کا زمانہ تھا۔ آرٹ، ادب، ڈراما، موسیقی، ہیلے انٹیریر ڈیکوریشن
_____ ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں
اسے مسز بیسنٹ اور ڈبلیو۔ بی۔ بیٹس اور کرشنا مورتی اور اوکسفورڈ یونیورسٹی کے
پروفیسر رادھا کرشنن کے مطالعے کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلٹ
اور ایڈرپاؤنڈ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے
الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل ونچسٹر سے (نہیں۔ میں ایٹن کبھی نہیں گیا۔

ونچسٹر بھی اتنا ہی خوفناک تھا)۔ کیمبرج بھیجا گیا (میں کیمبرج نہ جانتا تو کیا گروکل کانگری جانتا؟) وہاں پیٹر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا اور پھر مسلسل تفریح، مسلسل تفریح، مسلسل ڈینی ڈی پشمن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا، لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبار پائلٹ بن کر چند خوبصورت جرمن شہروں کو جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے، اس نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

اس کے بعد وہ پھر کالج واپس آیا اور ہیگل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے ادھورا چھوڑ کر وہ انیر فورس میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا تھا یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کیے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ امن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت کے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ویلیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ آلدس بکسلے اور جیمز جوائس کی طرح سوچتا۔ اب ڈینی ڈی پشمن کا دور از سر نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریا کاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلخی آگئی تھی۔ مائیکل اور ڈینس اس کے ساتھی تھے۔ مائیکل یہودی تھا ڈینس بھی مائیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے سرل نے بہت امید کی کہ ذرا ان میں اسنوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈینس کو شاعری کی سودا تھا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے، یورپین لڑکے۔

اور لڑکیاں۔

سرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا، بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا ایک ایسا عظیم عہد تھی جس میں دنیا بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے اور کلچر مفاہمت (یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا) کے دور میں داغ ہو رہی تھی اور کیسی کیسی لڑکیاں دنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لیے آرہی تھیں۔ کالی لڑکیاں، پیلی یعنی مشرق بعید کی لڑکیاں (یاد کرو پل بک کے ناول)، نیکر لڑکیاں جن کو دیکھ کر جدید سنگتراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جون کارٹر تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حلیہ درج ہوتا ہے اس پر وہ پوری اترتی تھی۔ سیاہ فریم کی ہیلرینا عینک لگائے سر پر جھوٹے بال، انتہائی انکلشول۔ یہ ٹائپ اب پچیس تیس سال پرانا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہ تھی۔

روز میری تھی۔ لیکن اس سے سرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کلچرل ایوننگز کا دور شروع ہوا جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلباء جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ”اور مثیل ناچ“ ہوتے (جو زیادہ تر بکو اس تھے سوائے سر یکھا کے ناچ کے)، نظمیں پڑھی جاتیں، بے سرے ساز بجائے جاتے۔ سنا تھا امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیمانے پر چلایا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس فارایسٹرن اور ٹڈل ایسٹرن تماشے سے اس کا جی اکتا گیا۔ اب وہ

اپنے کمرے پر لوٹا اور کوئی اس سے کہتا کہ تھائی لینڈ والے انڈونیشیا والے کلچرل
ایونگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کود کو باہر بھاگ جائے۔
”جانتے ہو سرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔“ ڈینس نے ایک روز
بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داخل ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دور
دراز لکھنؤ سے آئے تھے۔ (بڑی اداسی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے
اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی
پیشیمانی ہوتی)۔ نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کر کے چھپاتا کہ لارڈ فلاں کا بیٹا
ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیڈنٹ کہا تو وہ جھٹ لڑ کے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ
وارد کالوں سے اس کی کافی دن ملاقات نہ ہوئی گو اسے معلوم تھا کہ یہ بڑے
انگارے نکلنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا جس
سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی
ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آراء تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی جھگڑے نے
اس کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا گو وہ اس ٹننے کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک
اور کلچرل ایونگ ہو رہی تھی۔ یہ ایونگ انڈیا والوں نے منعقد کی تھی وہ جوتے اتار
کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید یگور جنیتی منائی جا رہی تھی۔
ڈینس فوراً مراقبے میں چلا گیا۔ مجمعے پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سرل
اپنی پتلون کی کریر کی فکر میں غطاں رہا۔ اس سے آلتی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا

رہا تھا۔ اس نے اداسی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سا دھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ بکرز ہوں گے شاید اس نے کاہلی سے سوچا ڈینس ان سب کو جانتا تھا۔ ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈینس ان سب سے نکھڑ ملے گا اور اس کا ان سب سے تعارف کرائے گا۔ یہ سوچ کر اسے پھر رسی آگئی۔

اتنے میں ایک بلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی اور کچھ اناؤنس کیا۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بچیں۔ سرل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سارا ہال جو چھوٹا اور گھریلو سا تھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سنٹر وغیرہ تھا، اسی طرح کی لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا اور قسم قسم کے لڑکے۔ سب بڑے کامریڈانہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔ روشن کی طرح ایک اور لڑکی۔ باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موٹے ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لیے کوئی انوکھا پن نہ رہا تھا، اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے لیے زیادہ مواقع ہیں اس نے یونہی سوچا کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اور یوگور کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ رومان پرست مڈل کلاس جذبات زدہ یوگی _____ اس نے بڑی عیاشی سے سوچا۔ (ان دنوں وہ مغربی عیسائیت اور

یورپین تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا)۔

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گداز سی بی بی اسٹیج پر آئیں۔ یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینان کلمتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرگیں آنکھیں، پھولے پھولے گال، کانوں میں سونے کے پھول، بڑا سا جوڑا _____ سیاہ ساڑی کے نیچے سفید پیچی کوٹ پہنے تھیں، جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا۔

پھر ایک عدد تقریر میں انہوں نے بتایا کہ یگور دنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔
”جانتے ہو یہ کون ہیں؟“ ڈینس نے بڑے رعب سے سرل کو مطلع کیا۔
ڈینس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبرو تھا۔

”اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ تھیا سوفسٹ ہوں گی یا ہندوستانی کلچرل کی علمبردار جو بتلائیں گی کہ atomic تھیوری کو سب سے پہلے شکر اچار نے پیش کیا تھا۔“ سرل نے بور ہو کر کہا۔

”یہ مسز شیلا مکرجی ہیں۔“ ڈینس نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔
”یعنی؟“

”ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے، اگر تم او بڑ روڑ کے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔“

سرل کے سامنے جو گونا گوں مسائل تھے ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔
 تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ بی بی سی؟ وہ پہلے ہی اس کی طرح کے
 اٹلکچوئرز سے اناٹوٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رائٹنگ؟ اس کی بھی
 گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور
 سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ محکمہ تعلیم؟ وہ کبھی
 کالج کے لونڈوں کو نہ پڑھائے گا۔ کولونیل سروس؟ یعنی میں سرل بشلے انسانیت
 پرست، کنیا یا ملایا یا ویسٹ انڈیز میں نوکری کروں گا، سولہ ہیٹ پہن کر دوروں پر
 جاؤں گا، شام کو کلب جا کر گوف کھیلوں گا؟ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری
 جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔

پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر بتر ہوا اور لڑکے لڑکیاں ٹکڑیوں میں منتشر ہو کر
 زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ڈینس اٹھ کر شریعتی شیاں دینی کے پاس گیا جو
 اوبزور کے کالم نگار بل کریگ سے باتیں کر رہی تھیں۔ ”ہیلو ڈینس“ انہوں نے
 مسکرا کر کہا۔

”مسز مکر جی ہمیں اپنے گھر لے جا کر کافی نہیں پلائیں گی؟“ ڈینس نے اپنی
 بچوں والی اداسے ذرا مچل کر کہا۔
 ”ضرور۔ سب لوگ چلو۔“

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی نذرا لا
 سلام کی جینتی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سرل کو یہ مجمع بڑا دلچسپ
 معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوسپ تھی،

اپنی مصروفیات۔ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر یہ شادیاں بڑی سنسنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

”چلو۔ چلو۔“ وہ سب شور مچاتے باہر آ گئے۔ گلی نیم تاریک تھی۔ لڑکے سگریٹ خریدنے کے لیے ایک پب میں چلے گئے۔ لڑکیاں کہنے لگیں: ”شیلا دیدی تھوڑی سی ترکاری خرید لیں۔ آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔“

مسز مکر جی کا فلیٹ چیمپسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا۔ جس میں لفٹ لگے تھے اور گیلریوں میں دبیز قالین بچھے تھے اور رودی پوش پورٹر تھے وہ سب فلیٹ میں داخ ہوئے لڑکیوں نے سرل سے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ روشن کی طرح tense نہیں تھیں۔ بڑے گھریلو اور سیدھے اسادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام طلعت تھا اور دوسری کا نرملا۔ لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں اسے معلوم ہوا اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مسز شیلا مکر جی فرید پور، مشرق بنگال کی رہنے والی تھیں۔ ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ، کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔ انہوں نے خود و شہر بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی۔ (شادی مائی ڈیر، ایک جوا ہوتا ہے۔ گرو ویو نے کہیں پر لکھا ہے کہ۔۔۔) ان کا ایک لڑکا فلائنگ آفیسر پر فلا مکر جی ہندوستانی فضا نیہ میں ہوا باز تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ مسز مکر جی اب مدتوں سے یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

”لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں کہ تم ان پر لٹو ہو جاؤ۔“ دوسرے روز ڈینس نے برامان کر کہا، وہ لوگ کالج کے ڈاننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ دورویہ سیاہ عباؤں کی قطاریں۔ چھری کانٹوں کا شور۔ ہال کے سرے کی میز پر پروفیسروں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی جھنجھناہٹ۔ اونچے درتچے میں سے باغ کا منظر ٹرنز کی کسی پیننگ کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

”ایس؟“ سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

”لیکن وقتاً وقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو، وہ اوپر زور کی کورسپونڈنٹ شپ۔۔۔“ ڈینس نے کانٹا ہوا میں ابرا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب اند گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جینیوا جا چکی ہیں، وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پہچان کر ذرا سا مسکرائی۔ ”ہلو۔“ اس نے کہا۔

سرل نے شائستگی سے جھلک کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا، یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز یگور جینیٹی میں اسٹیج پر اناؤنسمنٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈینس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے، چمپا نے یاد کیا۔ ”میں بھی مسز مکر جی سے ملنے آئی تھی۔“ اس نے میٹر صیاں اتر کر سڑک پر آتے ہوئے کہا، ”مگر وہ جینیوا گئی ہوئی ہیں۔“

”آپ یہیں پڑھتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سر یوا استوا کو جانتے ہیں؟ وہ

گرٹن میں ہے؟“

”جی ہاں۔ میں مس سر یواستوا سے یہیں ملا تھا۔“

”اور کمال رضا؟“

”سرمیکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ

روشن آراء کو جانتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرمالریو استوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن

”ہیں ہے؟“

”جی ہاں۔ میں مس سر یو اسٹوا سے یہیں ملا تھا۔“

”اور کمال رضا؟“

”سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ

روشن آراء کو جانتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں نے بھی سیکھا اور ڈینس ہی سے ان کا ذکر سنا ہے۔“

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اس طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو

جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فلیورہ چکا

-2-

”آپ نرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں؟“ چھپیا نے باؤز بلند اسفسار کیا۔

”جی نہیں“ میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے

میرا حلقہ احباب ڈینس کی مانند وسیع نہیں ہے۔“

چمپا کھلکھا کر ہنس پڑی۔ ”میرا خیال تھا آپ شاید ینگ اشوتوش سے مل چکے

“ہوں۔“

”میں یگ اشوتوش سے نہیں ملاؤ وہ کون ہے؟“

”مسز مارجی کا چھوٹا لڑکا، وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔“

”چیلسی کا انڈرگر اوٹڈ آگیا۔“

”اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمرج میں ملاقات ہو، اگر آپ کبھی وہاں آئیں۔“

”یا شاید نہ ہو!“

”بہر حال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔“

”خدا حافظ!“ وہ ایک اخبار خریدنے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسپریٹ پر اتر گئی۔ ایک مکمل، پر اعتماد جدید ہندوستانی لڑکی۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈ لی کے انڈر میں چمپا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سر یکھا کے یہاں سب جمع ہو کھانا کھائیں گے۔ سرل بیتاب تھا کہ سر یکھا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بحث کرے۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا کہ سرد جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا جو رویہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے اینگلو امریکن بلاک، ظاہر ہے اس کو پسند نہیں کر سکتا، وغیرہ وغیرہ۔ سر یکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا انکارے اگلنے والا انسان ہے۔ حال ہی میں ماسکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ سرل کو افسوس تھا کہ آج شام کو وہ اس

شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سر یکھا کی اطلاع کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ٹہلنا رہا۔

۶۰

کیمبرج میں ایک دکان سے نکل کر نرملالا بھیریری کی طرف جارہی تھی کہ اسے گوتم نیلمبر دکھائی پڑ گیا۔

”نرمل _____ میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“ گوتم نے لپک کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ایک انگریز مجرد خاتون تمہارے کالج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا، پھر کمال نے کہا شاید اس وقت تم لا بھیریری میں ہو _____ کیسی ہو _____ کیا حال چال ہیں؟“

نرمل نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا۔

”تم یہاں کیسے آ گئے؟“

”لندن سے آیا ہوں، تم لوگوں سے ملنے۔“

”سنا ہے تم اب باقاعدہ فارن سروس میں ہو۔“

”ٹھیک سنا ہے۔“

”نرملہ نے دہرایا۔ گوتم اب بھی خاموش رہا۔“

”شیلا دہی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باتیں کر لینا بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے یہاں کافی پلانے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور ہیں، مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی مسرت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انہوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔“

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرملہ کو غور سے دیکھا۔

نرملہ کی آنکھوں پر بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف اور کہتی رہی:

”یہ سِرل کا دور ہے کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا بیٹا ہے جس طرح تم سر دیپ نرائن اور بھیا صاحب سِرڈ کی رضا بہادر کے فرزند تھے۔“

”نرملہ تم چمپا کے ساتھ بہت بے انصافی برت رہی ہو۔“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں گوتم، یہ واقعہ ہے۔ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کہ وہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل کمال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طلعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہی تھی۔ اس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں، ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔“

گوتم نے اداسی سے دیکھا۔ نرملہ نے بات جاری رکھی۔

”پیرس میں تھیں مگر کام اُدھورا چھوڑ کر انگلستان آ گئیں۔ اب سنا ہے لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ حد ہے۔ گوتم، چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔“

جیٹرس لین میں سے ٹرمیٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھٹھک گیا۔

”جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دھنیں بجاتا ہے۔“ نرملا نے کہا۔ بارش کی پھوار میں اس کے بال بالکل بھیگ گئے۔ ”بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی پیننگر دکھاتے رہتے ہیں۔“

اب وہ کوہ نور تک پہنچ چکے تھے۔

”گوتم، نرملا نے سوچتے ہوئے پوچھا، ”لوگ اتنے پھٹپر کیوں ہوتے ہیں؟“

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طلباء کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے لا تعداد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیم کی سطح پر جلت رنگ بجا رہی تھیں۔

”نرملا، گوتم نے رک کر کہا۔

”فرمائیے۔“

”تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں _____ نزل _____“ آواز اس کے حلق میں اٹکی۔
 ”اس لیے“ نرملانے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا، ”کہ تم بھی پھنچر ہو۔
 آؤ اندر چلیں۔ بارش میں مت بھیکو۔“
 نرملہ واقعی بڑی ہو چکی تھی۔
 وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے۔

۶۱

صبح چھ بجے چمپا اٹھ بیٹھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی، وہ دو بجے تک سر یکھا کے یہاں گپیں ہانکتے رہے تھے۔
 آخر لوگ اتنی باتیں کیوں رکتے ہیں؟ غسل خانے میں س ے جون نے سر نکال کر جھانکا۔ ”آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔“ چمپا نے بستر سے اتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا، پھر اس نے جون کو آواز دی: ”میں ورکنگ کلاس لڑکی ہوں۔ بتاؤ کون سی ساری پہنوں۔“ پھر ناشتہ کر کے وہ بس میں بیٹھی اور سینٹ جانز ووڈ پہنچی۔ بل کے فلیٹ پر جا کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ”کم آن ان _____“ کسی نے اندر سے بٹاش آواز میں کہا، وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوفہ بچھا تھا۔ نیچی تپالیوں اور الٹرا ماڈرن آرٹسٹک طرز سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں لٹکی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک الیشن کتابے نیازی کی شان

سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ بل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ”ہو مائی ڈئیر۔۔ کیا پیو گی؟“ ”کچھ نہیں۔ شکریہ“ چمپا نے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بوہیمیا کے افراد کس اپنائیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔

”پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟“ بل نے بے پروائی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جا کر کھڑ پٹر کرنے لگا۔

شاننا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سرخ [ھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اتری جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شاننا چمپا نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے برسک انداز میں وہ ٹائپ رائٹر پر جا کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے بل سے شادی کیوں کی۔ عجب گھپلا ہے زندگی۔ چمپا نے تعجب سے سوچا۔ ”گڈ مارنگ مسز کریگ۔“ اس نے اخلاق سے کہا۔ سنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لیے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی۔ اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں۔ مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا۔

”میں گوتم سے تمہارا بہت تذکرہ سن چکی ہوں۔ یہ بڑی مختصر دنیا ہے۔“ شاننا نے ٹائپ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

بل کافی کی کشتی اٹھا لایا۔ چمپا نے محسوس کیا کہ شاننا خاصی مغرور ہے۔ بل اتنا ہی خلیق تھا۔

فرینک وہ کاغذات کا پلندہ اٹھا کر پریس جانے کے لیے تیار ہوئے۔ چمپا کو بل کے پبشنگ ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے زندگی کا۔“ بل نے اس سے لہجے کے وقفے میں پوچھا، وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

”یہ تو بڑا زبردست سوال ہے۔“

”کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو؟“

”ہاں۔“

”تم بھی جال میں گرفتار ہو؟“

”ہاں۔“

بل منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔ سب جال میں گرفتار تھے، وہ خود اور اس کی بیوی شاننا جو پہلے شریعتی شاننا ٹیلر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں ناول لکھتی تھی اور سرل لیشلے اور سارے مصنف اور ادیب اور ذہن پرست، سارے مغربی انسان، اور مغربی یورپین تہذیب، اور نیا ایشیا، جس کے نمائندے یہاں موجود تھے، مختلف جہنموں کے درمیان معلق تھے۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ پل صرار پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیف لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹولبی نے دس کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

اور نیا ہندوستانی اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ پبلیٹی کی دنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے

پمفلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دنیا اور بل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن میں یقین رکھتا تھا اسی لیے وہ شام کو اپنے اسٹوڈیو فلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی، وہ بھی جال میں گرفتاری تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جہنمیں، ذاتی تہ خانے اور نجی کائناتیں زیادہ تکلیف دہ تھیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بل نے چپا کو دیکھا۔ ”کیونست کبھی نہیں بنیں؟“

وہ چپ چاپ بیٹھی آلوکھاتی رہی۔

”تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو لڈاپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے نرائن اور ملک کو دیکھو۔ تم بھی لکھو سمجھیں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”افسوس کہ میں تمہارا مطالبہ پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔“

”اچھا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہارے گروپ میں تو ایک سے ایک لیکھک موجود ہیں۔“

”مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔“

”اچھا۔ تو آپ کا fad یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی۔“ بل نے جواب دیا، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دفتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر بیٹھی رہی۔

یہ چوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جاننے والے دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے وہ ویس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داغ ہوئیں اور اس کو دیکھے بغیر کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں۔ ”یہ چمپا احد ہیں۔ دوسروں کے منگیترا پھانسا ان کا کریز ہے، اگر تم سمجھو کہ میں اکیڈل مونگرنگ کر رہی ہوں تو نرملا سر یو استوا سے پوچھو جسے بی بی ہو گئی ہے۔“ ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے بڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نرملا کو بی بی ہو گئی؟“ دوسری نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، اور وہ ڈھرسٹ سینی ٹوریم جانے والی ہے۔“ پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی اپنی اپنی بڑے اٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور ان سے پوچھے: نرملا کیسی ہے؟ اسے بی بی کس طرح ہوئی؟ مگر وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ درتپے کے باہر سڑک پر سے رنگا رنگ جھوم گزر رہا تھا، پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں اپنی اور آتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ماسک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے: زرینہ، سریکھا، طلعت، نرگیش، کملا، فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے، وہ سب نرملا کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پریشان نظر آتے تھے۔

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سرل کی ہم جماعت روشن آراء تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں

کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سو اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے تھے اور زیادہ اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے چمپا کو دیکھا۔ ذرا ٹھٹھک کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دور کرنے کی میز پر جا بیٹھے۔

”یہ دونوں ہم سب سے دور رہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔“ طلعت کی میز پر کسی نے ہنس کر کہا۔

”اچھا ہی ہے۔ ہماری سنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔“ کسی اور لڑکی نے جواب دیا۔

”اور ایمان جو خراب ہو گا وہ الگ۔“

“وہ الگ”

چمپا نے خلاف ارادہ سراٹھا کر ان کو دیکھا: سید عامر رضا، گل فشاں والے، لا مارٹینئر کالج والے، بھیا صاحب۔ انسان جن لوازمات اور ایسوسی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے وہ پل کی پل میں کیسے بدل جاتے ہیں! اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری لڑکی۔ جو ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ دنیا کے اندر اور کتنی دنیا میں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طلعت کی میز کی طرف گئی اور ان لوگوں سے زملا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔
وادی میں ٹرینیں مکانون کے پیچھے الگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتر کی اور
جاری ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈولتی ہے۔ آرام
کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یار و مددگار آنکھوں سے سامنے
کا دھندلا دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر
کھا رہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی لاء
کورٹس سٹی کی اور جارہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے
سے انکار کروں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ چوزے کی سرائے میں
وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ
zero-hour ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر لڑائیاں لڑی جارہی ہیں اور سال ختم
ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کرائسن آکر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں جبکہ آج
کی تہلکہ خیز خبریں کل ردی میں بکتی ہیں۔

گو سینٹ سیتیاں اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی
گزری ہوں۔ ہم سب گزر رہے ہیں۔ میں نے اس میں بیدر کے چھوٹے چھوٹے
شگوفے جمع کیے تھے۔ (طلعت نے کہا۔)

وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔‘ وہ کہانی کیا ہوگی، کہانی لکھنے والا کون ہے اور سننے والا کون؟ جی ہاں، میں نے پروفیسر رادھا کرشنن کے لیکچر اسٹنڈ کیے ہیں۔ جی نہیں۔۔۔ میں ہیگل پر مونو گراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر بل سے کہا۔ جی نہیں مجھے دیانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے، وہ باتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گزر رہی تھیں۔ تھیٹروں میں تمثیلیں اسٹیج کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسٹوڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند اندر جھانک رہا تھا جہاں ناکام مصور اور گمنام ادیب اور دو متمند مصور اور مشہور ادیب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حد نظر تک مکان تھے جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور ٹڈل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان اور قلعے اور محل اور کانٹج۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور ناامید اور کامرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈی نیرو کی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا تھا: سرخ اور زرد اور سیاہ دھبوں اور لکیروں کا ہیبت ناک مجموعہ۔

جون کارٹر کا مکان ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں وکٹورین عہد میں اصطل تھا۔ اصطل کے اوپر کوچمین کے کمروں میں جون اور نیل اور اوجیت رہتے

تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتہالی جماعت کا سیکرٹری تھا۔ اوجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کیمبرج میں سرل سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور یہاں یونیورسٹی میں ہنگرین زبان پڑھاتی تھی۔ کوچمین کے کمرے بہت خستہ حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ جس میں وہ گھڑیاں اور بچوں کی موٹریں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر کسی مشہور ایکٹر سے شادی کر لی تھی بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت میں بے حد اذہاک اور تندہی سے کوئی میکنیکل کھلونا تیار کرتا اور مہینے کے آخر میں اسے اپنے بچوں کو دے آتا وہ بے حد کم گوانسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹونا صوفہ بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسٹوو کے اوپر ریڈیو رکھا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ نیل اسے ہمیشہ اوور ہال کرتا رہتا تھا۔ نعمت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن دھونے کا حوض برتنوں سے بھرا رہتا کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کاہل تھے۔ الماری میں سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا ٹکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی کیونکہ اس گھر کے مکین بے حد مفلس تھے۔ اوجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تنخواہوں کا بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اوجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا جو بیک وقت اس کی سنگھار میز، ڈیسک، کپڑوں کی کھونٹی اور بک شیلف کا کام دیتا۔ بہت سے خیر خواہوں نے کمرہ مت باندھ کر اوجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان سب کوششوں کو کامیابی سے رائیگاں کرتا رہا۔ غسل خانے کی چھت کے باہر ٹیرس تھا جس پر تام چینی کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا

صندوق پڑا تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آکر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صبح لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی گاڑی آکر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دہلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکل پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جون کارٹر کا کمرہ اس فلیٹ میں گویا ہر میجسٹری کوئین ایلزبتھ کے کمرے کا درجہ رکھتا تھا۔ الماریوں میں ان گنت کتابیں ٹھنسی تھیں کیونکہ بہن جون کارٹر اللہ کے فضل سے چھ سات یورپین زبانوں کی ماہر تھیں۔ آتشدان پر رنگ برنگی گڑیاں اور مشرقی یورپین ممالک کے نوا درجے تھے کیونکہ جون ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تحفوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے درتچے میں سرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر ٹیلیفون لگا تھا۔

چمپا احمد چند ہفتے قبل پیرس سے آکر جون کے یہاں ٹھہری تھی جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اسے جون دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک امن کانگریس کے لیے وارساتک جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم یہیں رہو۔ راشنلے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور اوجیت سے کہے جا رہی ہے کہ وہ ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی تم کو باقاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

صبح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گئی اور ناشتہ کیا اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈرینگ گاؤں پہنے اپنے اپنے کمروں میں سے نکل کر گڈ مارنگ کہتے چاء پینے کے لیے آجائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم

ہی نہ لالہ تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب نہ دار۔ نوبتے اوجیت سوکراٹھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے، ارادہ ہے پلنگ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ ٹھنڈی چاء پی کر بڑے اطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے زینے پر سے اتر گئے۔

فرانسیسی انداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرائی اور برساتی اوڑھ کر اس نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔ یہ دستور العمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڈ ہوئی دوسرے سے بات کر لی ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ دیک انڈ پر فیروزیا سیکھا کے یہاں محفل جمتی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنارس اور لکھنؤ اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹرن کی بھی عادی ہو گئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سنا تھا کہ اب وہ بے حد اہم آدمی بن گیا ہے، بے انتہا مسروف رہتا ہے، انڈیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کار پرواز افسر ہے۔ کمال کیمبرج میں تھا۔ ہری شکر امریکہ میں۔

ایک روز وہ اور اسب کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کانفرنس میں گئی جو سیکس کے سوبزہ زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناچتے اور گاتے اور سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک رات جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے سبزے پر پناہ تھا، اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سرسرا تا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے، جس طرح سبکزامندی پر خطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تندرو

ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹان پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ انٹرنیشنل گارہا تھا، بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی، اردو اور فرانسیسی میں ادا کیے جا رہے تھے، وہ کان لگا کر سنتی رہی: دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہمان لیے۔

One great vision unites us, tho' remote be the
l a n d s o f o u r
birth.

Foes may threaten and smite us, still we live to
b r i n g p e a c e
to the earth.

Ev'ry country and nation stirs with youth's
a s p i r a t i o n .

Young folks are singing, happiness bringing,
F r i e n d s h i p t o
all the world.

Ev'ry where the youth is singing freedom's song,
f r e e d o m s
song, freedom's song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے، ان کے ساتھ کیا ہوگا، باہر کی دنیا کے

ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے؟ برابر سے برطانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی ویلش لوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جارہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ایلٹ کے کردار کی طرح دہرایا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی باتیں کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھندلکے میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروز اور طلعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے باتیں کرتی سبزے کی طرف جارہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل چطور سے گھلی ملی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ہمیشہ ہر جگہ علیحدہ رہوں گی، اس نے اپنے آپ سے کہا، حالانکہ اوجیت مجھے ساری ہسٹری آف سویوٹ کمیونسٹ پارٹی پڑھا چکا ہے۔ آخر میں وہ سب کیوں نہیں کر سکتی جو دوسرے کرتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا کر کجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گربار میں شامل ہو گئی جو باغ کے ایک حصے میں جاری تھا:

ہے گووند راگھو چرن اب تو جیون ہارے
 سندھ کے کنارے سندھ کے کنارے
 لڑکیوں نے دہرایا۔

الاؤسر دہو چلا تھا، وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا۔ بارن میں سے کارڈین کی آواز آرہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب ”لٹریچر ان دی آف سائنس“ ایک گھنٹے سے زیر بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاندی کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آچکی تھی۔

”مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اپنے متعلق؟“ طلعت نے جواب دیا، ”ہم لوگ _____ ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔ قطعاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقلوں اور عمروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا لیکن اس کے باوجود ان کی فرشتوں کی ایسی شفقت کی وجہ سے، گرما کی اس خنک رات کو دفعتاً کیسی یگانگت محسوس ہوئی وہ اتنے بڑے مل آسمی تھے دنیا کے چوٹی کے دماغوں میں سے ایک، اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے: ”جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو، حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا، پر میں نے سوچا، میری قوم نے اتنی صدیوں تک جو برتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہے ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ اس کا کنارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ تم لوگ جب بھی کہو میں تمہاری محفل میں آشمیل ہوں۔“ بلعت نے ایک خشک ٹہنی آگ میں پھینکی اور اس نے ہائی مین لیوی سے کیا: ”ہم تو اتنے ہو نہی سے لوگ ہیں اور غالباً سخت خوف زدہ جو طامس

بیکٹ کے کورس کی پجاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں:

”فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گلے، ہم خود خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سر زمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھو لوں تو ان میں سے بھی خوب بہنے لگتا ہے۔ میں ٹھنڈے موسم بہاراں کی طرف کس طرح لوٹوں؟“

”فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ۔“

بارن میں یکلخت گٹار کی آواز بلند ہوئی۔ ایوان مک کال کی صاف، گہری آواز سارے میں چھا گئی۔

”اب رات زیادہ آگئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی اسٹیشن سے شہر کے لیے ٹرین پکڑ لوں گا۔“ پروفیسر لیوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ _____ آپ پیدل جائیے گا؟“ فیروز نے گھبرا کر کہا۔

”کیا حرج ہے؟“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔“

لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں مختلف یورپین زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں ایک کارآن کرر کی۔

”الو _____“ عامر رضا نے آواز دی۔

”الو _____“ اوجیت نے خالص فرانسیسی لہجے میں نعرہ بلند کیا۔

”آئیے آئیے بھیا صاحب۔“ طلعت نے کہا۔

وہ سب بارن میں داخ ہو گئے۔

”میں جلدی میں ہوں۔ دور سے گانوں کی آوازیں سنیں تو ٹھٹک گیا۔“ انہوں نے طلعت سے کہا، پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گی ۹ لنٹ انداز میں جھک کر مخاطب ہوئے: ”مجھے اپنا سیکوفون دو۔“

”بھیا صاحب، آپ ایوان سے ملے ہیں؟“ فیروز نے لکھنؤ کے ناٹے سے ان سے اخلاق برتنے کی سعی کی۔ ”یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈ گانے والے ہیں _____ اور بہترین ڈراماٹسٹ۔“

”مجھے اپنا سیکوفون دو _____ میں تمہیں وینس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔“ عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ _____“ فیروز نے جھنجھلا کر ان سے سوشل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

”آئیے یہاں بیٹھئے عامر بھائی۔“ ونود نے ان کے لمبی پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طلعت اور کمال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ ”ترقی پسند عوامی محاذ خطرے میں ہے۔“ سر یکھانے چپکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

”بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہے۔“ فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

”اور بہن مریدا گرزولی اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لیے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو وینس کے گیت سنائیں! یا اللہ تو ہی رحم کر۔“ طلعت نے جل بھن کر کہا۔

”یہ بھی تو اپنے وقت کے رڈولف ویلنٹینو ہیں۔“ شیلا نے اظہار خیال کیا۔
لڑکوں نے پرچھتی پرچڑھ کر ایک اسپینش گیت شروع کیا۔
”اچھا بھئی بون نوئی۔“ کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
”بون نوئی۔“ کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سیبوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔
”_____؟“ ایوان نے مجمعے کی طرف استفسار نہ نظریں اٹھائیں۔
”یہ مک کال صاحب _____ ایک ایسی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔“ میروز نے کھڑکی میں سے کہا۔

”ماشاء اللہ سے کس قدر پروفانڈ بات کہی ہے۔“ طلعت نے داد دی۔
سب نے مل کر امریکن حبشیوں کا بیلڈ شروع کر دیا:

For if you are white, you're all right;

If you are brown stick around,

But if you are black,

Oh, no! Brother, get back, get back, get

back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع سناٹے میں گونجتی رہی، پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیبنوں کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔
لوگ کیبن میں ساری لڑکیاں آچکی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے سارے صوبوں سے آئی تھیں اور بیرسٹری پڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹر کے لیے کام کر رہی تھیں اور اخبار نویس اور ڈاکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس دان تھیں اور آرٹسٹ تھیں اور گاتی اور ناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفتے سے کانفرنس میں نہایت مدلل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باورچی خانے میں مندوبین کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سناٹا آسمانوں سے اتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دور پر خانہ بدوشوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس برستے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

۶۵

اے ہمارے آسمانی باپ، ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔
طلعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اسٹیشن میں پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی اور سرپٹ دفتر کی طرف دوڑی۔ آج ککل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوز روم میں وہی گہما گہمی تھی۔ اس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو الٹا پلٹا۔
اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

”ہلو ہلو _____“

”ہاں کون ہے بھائی۔“

دوسرے سرے پر فیروز دھاڑ رہی تھی۔

”ساجدہ آپا کسی بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں۔ چچا نے کہا ہے فوراً
اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرویو کرو۔“
وہ سہ پہر کو اسٹوڈیو پہنچی۔

بی بی سی کی کنٹین میں حسب معمول شور قیامت مچا تھا۔ یورپین مڈل ایسٹین
اور ایسٹرن سروسز کے لوگ اپنے اپنے دفاتروں سے نکل کر لُنج کے لیے آ رہے تھے۔
ہسپانوی، اسرائیلی، عرب، ایرانی، فرانسیسی، ہندوستانی، پاکستانی
_____ ان سب کی عجیب و غریب برادری تھی۔ بہت سی میزیں برابر
برابر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی کراؤڈ اکٹھا بیٹھا کرتا۔ یہ تقریباً سارے یک
سارے اولڈ ٹائمز تھے: صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے جگت چچا اور
اپنی ذات سے انجمن تھے، یا ورعباس، اعجاز بٹالوی، فتی سید، آل حسن، عطیہ زرینہ۔
”اور وہ وفد آگیا جس کا انٹرویو ہے۔“ طلعت نے اندر آ کر فیروز سے
پوچھا۔ کنٹین میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کاشا بجا رہی
تھیں۔ ”اب چلو ان کا انٹرویو کرنے۔“ زرینہ نے چپکے سے کہا۔

”ان کا _____ ان کا _____“

”اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہو کر آ رہا ہے؟“

”یہی تو وفد ہیں“ زرینہ نے اس انداز سے کہا گویا اب دنیا کا کوئی رنج و غم اس پر مزید اثر نہیں کر سکتا۔

”_____ بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پیتے رہتے ہیں۔“ ساجدہ بیگم بیزی سے فیروز سے مخاطب تھیں۔

”جی ہاں۔۔۔ بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔“ زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔
”کون؟“ طلعت نے چپکے سے پوچھا۔

”اطالوی یا غالباً فرنچ۔۔۔ ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفا ہیں۔“ زرینہ نے بتایا۔

”چچ چچ۔۔۔ پورڈیرز۔“ طلعت نے کہا۔

”بوش“ ساجدہ آپا نے بات ختم کی ”مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔“

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ”جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔“

”بوش“ ساجدہ آپا نے بات ختم کی ”مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔“

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ”جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔“

طلعت نے منڈھال ہو کر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

”دیکھو، ساجدہ آپا، گپ نہ ہانکو۔ مجھے معلوم ہے تم میڈرڈ کبھی نہیں گئیں۔“
”چلو میڈرڈ کے بجائے اوسلو کر دو۔ فرق کیا پڑتا ہے؟“ زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

”اور اہلیہ اہرن برگ کون ہیں؟“ فیروز نے طلعت سے مطالبہ کیا۔
”یہ اہرن برگ صاحب کے گھر میں سے ہیں۔“ زرینہ نے جواب دیا۔

”دوسری بات یہ کہ یہ میڈرڈ میں کر رہے تھے؟“ فیروز نے مزید جرح کی۔
”کہاں میڈرڈ کہاں غریب اہلیہ۔“
ساجدہ بیگم نے کھسر پھسر سنی تو اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لمحوں کے لیے زرینہ کو دیکھ کر چونکیں کہ یہ سبز فراک میں ملبوس بلونڈ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آ گیا کہ یہ زرینہ ہے۔ ”کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“

”ہاں پیاری بہن۔۔۔ پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا۔“ زرینہ نے طلعت سے کہا۔
ساجدہ بیگم نے جو مانی ہوئی زمانہ لیڈر تھیں، کہنا شروع کیا: ”مجھے یہاں کا طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔“

”کتنی خوشی کی بات ہے۔“ فیروز نے کہا۔
”ہالینڈ میں جہاں میں ابھی گئی تھی، ہر جگہ لالہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔“ انہوں نے مزید انکشاف کیا۔

انٹرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد سنا گیا کہ ساجدہ آپ نے طلباء کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کو پن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتلایا کہ بانی دی گریس آف اللہ _____ اس کے چند روز بعد اطلاع ملی کہ سید عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استانبول کھانے پر مدعو کیا ہے۔

یہ دعوت ساجدہ آپا کہ لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

۶۶

وقت کالے بھتنوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت جو گزر رہا ہے آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوند کی ماں مریہا۔ جس کا دل سات بار زخمی ہوا۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے پرانے دشمن۔ روشن سیبوں کے سائے میں چلتی رہی۔ جیرس لین میں کسی نے ٹرپٹ پر ایک پرانی دھن بجانا شروع کر دی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جا رہا تھا۔ ایک کتا ہنستا ہوا اسے عبور کر رہا تھا۔ پتلی ٹہنیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں ایک بٹخ تیر رہی تھی۔ وہ کواڈرینگل میں داغ ہوئی۔

”روشن۔“ کسی نے درتپے میں آکر اسے آواز دی۔

”روشن۔“ اندر آؤ۔ کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آرہی ہو جس میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں؟“ سرل نے دروازے میں آکر کہا۔

”نہیں۔“ اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ”نہیں۔ میں محض ہیزل میرٹک گئی تھی۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”ڈینس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔“

”ہلو ڈارلنگ۔“ سرلکھانے آتش دان کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم کب آئیں۔“

”میں؟ مجھے کیمرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔“

”میں اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنون کروں گا۔“

ڈینس سرلکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن درتپے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سنتی رہی۔ (پھر یہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے یا حلق میں کینسر نکل آنے کی وجہ سے ختم ہوئے۔ چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں، شہرت پائی اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آ گئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے)۔

”ہونہہ_____خدا۔“ ڈینس کہہ رہا تھا۔

”خدا_____“ سرکھانے کہا۔ ”جب میں ناچتی ہوں، مجھے لگتا ہے، واقعی شیو نے تلانا کے سروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل منجمد کر دیا جائے تو شاید خدا ہوگا_____ تلانا کی دھن کا احساس_____ پتا نہیں۔“

”ابھی شاید دروازے میں داخل ہوگا جس کا کوئی نام نہیں۔ دیکھو باہر ایک منحوس چاند پرانی قندیل کی طرح ڈول رہا ہے۔“ سرل نے کہا۔

”ویک انڈ کے لیے شہر چلو گی۔ میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔“ سرکھا، روشن سے بات کرنے کے لیے درپے کی طرف مڑی مگر روشن باہر جا چکی تھی۔

”چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میئر چلیں۔“ سرل نے سگریٹ رول کرتے ہوئے تجویز کیا۔

”کیوں ہیزل میئر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں؟“ مائیکل نے سوال کیا۔

”سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ڈینس نے کہا۔

”لہذا ہیزل میئر چلو“ سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

”روشن۔ ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں ہم تمہارے دوست ہیں۔“ سرل نے کہا۔

وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔ یہ وسط گرما کی رات ہے۔ چڑیلیں اور بھتنے اور اگیا بھتال درختوں کی چھاؤں

میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

سندیثور؟ روشن بھاگتے بھاتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔

تمہاری حقیقت دھندلکے میں چھپی ہے۔ عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا۔
میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔

پہاڑیوں پر روشنیا جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوٹ پہنے شکاری ویبر کی
دھنیں بجا رہے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہیمپٹن کورٹ اور سرل بشلے کے محل میں
داخل کیا جاتا ہے۔ مائیکل نے کہا۔

لیکن ہم بھوکے تھے لہذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا
کوئی نام نہیں۔

جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل
کھڑا کھڑا کو اپنی نظم سن رہا ہے۔ سریکھانٹ راج کے ایک انداز میں منجمد ہو گئی
ہے۔ ڈن طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔

”سنو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فاصلے کی فون کال کا انتظار ہے؟“ سرل نے
قریب آ کر عامر رضا سے دریافت کیا۔

”ہاں۔ نہیں۔“ عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتلا ہو گیا۔
ہمارے خواب مختلف ہیں۔ خالص خیال خوفناک ہے۔
تھہرو۔۔۔۔۔۔ تفصیلات کی دنیا میں ہمارا صیہون کہاں ہے؟
جلد بتاؤ۔۔۔۔۔۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس نے ایک لخت

گھبرا کر روشن سے پوچھا۔ وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ
چمپا ہے!

ہمیں دیر ہو رہی ہے _ _ _ _ _ جلدی
کرو _ _ _ _ _ جلدی _ _ _ _ _ چول _ _ _
چول _ _ _ چول _ _ _ چول _ _ _ پھاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہو
گئی ہیں۔ میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوائیں سنسنار ہی تھیں اب وہ آندھی
بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن
تھی _ _ _ _ _ میں تمہارے تھکے ہوئے پاؤں دھوؤں گی۔ تم گرم قالین پر
آگ کے سامنے بیٹھے رہنا _ _ _ جلدی _ _ _ جلدی _ _ _ دیر ہو رہی
ہے _ _ _

شور میں اضافہ ہو گیا۔ چلو _ _ _ چلو _ _ _ ہیزل میر چلو _ _ _ دلی
چلو _ _ _ چرچل کے گھر چلو _ _ _ دنیا بھر سے ایک ہوئے نو جوان۔ ایک
آدرش مہمان لیے _ _ _ خطرہ ہو بلیدان کا _ _ _ پھر بھی ہم لائیں گے
سکھ چین _ _ _ لائیں گے سکھ چین _ _ _

_ _ _ ان بستیوں کو جگمگانا ہے سدا _ _ _ ان کھیتوں کو لہلہانا ہے
سدا _ _ _ ہم، کیا گورے کیا کالے۔ سب ایک ہیں _ _ _ ایک
ہیں _ _ _ ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں _ _ _ ایک
ہیں _ _ _ کہہ رہے ہیں ہم ہیں شگفتی مان _ _ _ اور شو مانتا یہ سب
گان _ _ _ خطرہ ہو بلیدان کا _ _ _ خطرہ ہو بلیدان

کا_____ جوانیاں ہیں گارہی_____ ہنسی خوشی منا رہی_____ دنیا بھر
 سے ایک ہوئے نوجوان_____ نوجوان_____ کاروائی تو ہو کو پاٹ بھگ
 رے_____ بھنگ کو رے لو پاٹ_____ آزاد دلی میں ہیں۔ نہر و جینوا
 میں ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے۔ روشن، عامر رضا کے
 چکر میں ہے۔ مسٹر کھنہ یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔ معاشرے کی
 خرابیاں۔ کل میں نے ایک نیا کوٹ خریدا۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ۔ آلو کو
 دھوؤ۔ پتیلی کو دھوؤ_____

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔ خاموشی چھا گئی۔ چاند عین اوپر آ گیا۔ عامر رضا نے دفعتاً
 ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔
 وہ گپڈنڈی پر بیٹھی رہ گئی۔ سرل اور ڈینس مائیکل دلدل کے کنارے چلتے
 ہوئے اس کے پاس آئے اور منہ لٹکا کر ادھر ادھر بیٹھ گئے۔

یہ ٹھنڈے اور اداس دن_____ روشن نے سر اٹھا کر اس سے کہا۔
 بھیکے، نم خوردہ، خوفناک دن_____ سرل نے کہا۔
 بھاری، گھسنے والے، لنگڑے، اپانج دن_____ ڈینس نے کہا۔
 یوں ہماری زندگی بیتی ہے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
 ہمارے لیے کٹھن آزمائشیں ہیں۔

تکلیفیں

دل کا رنج

ندامت

پشیمانی
وہ مگن ہیں

ہم روتے ہیں۔۔۔۔۔

ہیزل میئر کا جنگل آہستہ آہستہ دھندلکے میں محو ہو گیا۔

۶۷

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

”ساجدہ آپا نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لیے مدعو کیا ہے۔“ طلعت نے

اطلاع دی۔

”صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی لومڑی کیوں نہیں؟“ سر یکھانے پوچھا۔

”دراصل ساجدہ آپا کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔“ طلعت

نے کہا۔

”تو پھر کرا دو ان کا انٹرویو رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براڈ کاسٹنگ

ہاؤس آتے رہتے ہیں۔“

”دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اورینجمن ہیں۔“

”اوہو۔۔۔۔۔ یہ بات ہے۔“ میروز نے کہا۔ پھر دفعتاً وہ چلائی۔ ”ارے یہ تو

واقعی بڑی ایکٹوٹی ہو گئی۔“

اٹھا لاؤ کھنجر ، کرو قتل ہم کو

بڑی دیر سے موڑی جھکائے ہوئے ہیں
طلعت نے کہا۔ (یہ قدیر کا پسندیدہ شعر تھا)۔

”یہ بات ہے تو آؤ میدان میں۔“ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ ہڑا کر فیروز
نے کہا: ”السلام علیکم لایئے میم کا۔“

اشعار کس کو یاد تھے لہذا پہلے غلط پڑھے گئے پھر حسب ضرورت ان میں ترمیم
کی گئی۔ نہ کرہم نشین بے وقوفی کی باتیں۔ میں بھولا نہیں ہوں وقوفی کی باتیں۔
خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی
سے استعمال کئے جانے لگے۔ ”یاد رکھنا چاند تارو اس سہانی رات کو۔ لاؤ واؤ کا۔“
طلعت نے کہا۔

”واہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“ کملا نے کہا۔

”یہ فاول ہے۔“ طلعت دہاڑ۔

”ہرگز نہیں۔“

”اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔“

”طلعت نے میز پر مکہ مارا۔“

”آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“ کملا نے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملا کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا: ”ہائے کٹ

کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“

”یہ سب ہو چکا ہے۔“ طلعت چلائی۔

”یہ دوسری مرغیاں ہیں۔“ کملا نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے روز ساجدہ آپا نے طلعت کو ویمنز پریس کلب میں فون کیا۔
 ”سنو ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چوہے دیکھنے سے معذور ہوں۔ میرا سارا دن
 تو بہت سے اصلی چوہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔“ طلعت نے کہا۔
 ”نہیں۔ مجھے تم سے رائے لینا ہے۔ ایک نہایت ضروری بات ہے۔“
 ”اچھا تم سیدھی یہیں آ جاؤ اور لنچ بھی یہیں کھاؤ۔ طلعت نے زور سے ریسیو
 ریخ دیا۔ شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اور جان آفت میں کر رکھی تھی۔“
 آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طلعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔
 وہ اینچیوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔
 ”کل میں عامر رضا سے ملی۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔
 ”یہ چوزے کی سرائے کا ذکر ہے جہاں آپ بی بی سی والوں کے ساتھ گئی
 تھیں؟“ طلعت نے دریافت کیا۔
 ”نہیں۔ ہم دونوں استانبول میں کھانا کھا رہے تھے۔“
 ”اوہ۔“

”اور پھر انہوں نے بتایا۔“
 انہوں نے بتایا کہ وہ مجمعے سے کتنا گھبراتے ہیں؟ کہ وہ سائے کی تلاش میں
 ساری دنیا میں گھومتے ہیں۔ جہاں سایہ ملا وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز دھوپ ان کی
 آنکھوں کو بری لگتی ہے؟

”ہاں کہا تو تھا۔ بالکل یہی کہا تھا انہوں نے۔“
 ”خدا یا _____ لو یہ گو بھی کھاؤ۔“ بلعت نے پلیٹ ان کی طرف سرکائی۔

”میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں ان پر ایک افسانہ لکھوں“ ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

”ضرور _____ اس سے عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے!“ طلعت نے ویٹر اس کو بلانے کا اشارہ کیا۔ ”کافی لوگی ساجدہ“ اس نے اونگھتی آواز میں پوچھا یا آئس کریم؟

برابر کی میزوں پر برطانیہ کی مشہور اخبار نویس خواتین ٹوپوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلہ خیالات کر رہی تھیں۔

طلعت اداسی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

۶۸

چمپا نے نرگیش کے کمرے میں آ کر نظر ڈالی۔ مانوس کمرہ۔ صوفہ۔ تصویریں۔ نیلے پھول۔ میرے لیے ایک ساری نکال دینا۔ نرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔ دوسرے کمرے میں شاہ نثار ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جا رہی تھی۔ اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔ بل نیچے کورٹ یارڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چمپا نے الماری کھولی۔ ایونگ گاؤں اور ساریاں اور جوتے اور بیگ۔ ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مندر تھا جس میں ایک ننھا سبوت رکھا تھا۔

پاری کس کا بت پوجتے ہیں؟ وہ سوچتی رہی یا شاید زرتشت یا جانے کیا۔ اسے
 پاری مذہب سے واقفیت نہ تھی۔ اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب
 کہ نہاں خانوں میں ایک چھوٹا سا شراٹن ہے۔ جس میں ایک گمنام بت رکھا ہے۔
 اس بت کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ سینٹ طامس۔ کرشنا نارائن۔ زرتشت۔
 یہ بت آخر وقت تک گمنام رہے گا۔ انت سے جب انسان کی آنکھیں آخری بار
 ہمیشہ کے لیے بند ہونے لگتی ہیں، اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے، وہ گمنام بت
 کون سی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ کسے معلوم۔

شانٹا نے اندر آ کر زنگیش کے لیے ایک سرخ ساری نکالی۔ ”الماری بند کر
 دو۔ الماری بند کر دو۔“ چمپا نے با آواز بلند کہا۔

”ہیں؟“ شانٹا نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ ”کس سے کہہ رہی ہو۔“
 ”کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار زنگیش یہ الماری کھولتی ہے۔“
 ”ہاں؟“ شانٹا بالکل نہ سمجھی۔

”اور اس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکلتے ہیں۔“
 ”ہاں۔ ہاں۔ تو؟“

”اور نیلی گھاس کا عطر۔ اور پیرس کی ٹوپیاں۔“ چمپا کہتی رہی۔ ”اس کا بت
 شراٹن میں رکھا رہتا ہے اس کو نے میں۔ اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں
 چھپا بیٹھا ہے۔ تمہاری الماری بھی کوئی بت ہے؟“

”میری الماری میں ڈھانچے ہیں“ شانٹا آتشدان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور
 اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ”تم۔“ اس نے کہا۔ ”تم تھوڑی

سی دیوانی ہو۔

”ہاں۔ تم نہیں ہو؟“

”تمہاری باتیں معرفت کی حدوں کو چھو رہی ہیں۔ اس طرف مت جانا۔ بڑی افسوسناک بات ہوگی۔“ شانت نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے، بال تو لیے میں لپیٹے باہر آئی اور درتپے میں کھڑی ہو کر ٹیرس گارڈن کو دیکھنے لگی۔ باہر، جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جگمگا رہا تھا۔

”زندگی _____ زندگی“ سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

”سریکھا میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔ بٹاش۔ رقصاں۔ تم علامتوں کی رمزیت کی قائل ہو؟“

چمپا نے مڑ کر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سرخ انگاروں کو دیکھا کی۔

زندگی میرے سامنے سہمی کھڑی ہے۔ سفید ساری میں ملبوس۔ ہنستی، گنگناتی، خوفزدہ، نڈر، باہمت، بزدل، ہر لفظ کے دو مختلف متضاد معنی ہیں۔ زندگی۔ اس نے شانتا کو دیکھا۔ میں نے ایک مرتبہ گوتم سے کہا تھا _____ میں اور تم، ہمیشہ مختلف رہیں گے۔

کئی سال قبل گلنشاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے، طلعت نے کہا تھا۔ چمپا باجی گوتم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تیار رہتا ہے۔ اس بات

سے خبردار رہیے گا۔ وہ کسی کو بخشنے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔

”مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑ ہے جو بات بے بات، ہر فقرے، ہر لفظ، ہر لکھے ہوئے جملے میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لا حول ولا۔“ اس نے جواب دیا تھا۔“

”گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟“ کرملانے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا۔

”بالکل“ طاعت نے جواب دیا تھا۔

”تب تو گوتم بہت برا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے نہ تلاش کیا کرے، خصوصاً آپ کی باتوں میں۔“ نرملانے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحاً بد تمیزی پر اتر آئی تھیں۔ نرملہ مجھ سے جلتی ہے _____ کس قدر واہیات بات _____ تبینہ کی طرح _____ لا حول ولا _____ میری باتوں س اسے مطلب! اس نے غصے سے سرخ ہو کر بار آور بلند کہا تین چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا: ”اور وہاں اس نے باتوں کو ایسی ٹو چھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بولنے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے؛ ہر علم میں وہ ماہر ہے۔ تو بہ آدمی نہ ہوا راکھش ہو گیا، دس سو والا۔“

”ہے۔ ہے۔“ تہینہ نے بڑی مہارت سے مہارت سے پیٹر کاٹتے ہوئے باورچی خانے دوسرے کونے سے کہا تھا، گوتم نے تم پر بہت رعب ڈالا ہے اور آگئیں تم اس کے رعب میں۔“

”میں نہیں آئی اس کے رعب میں۔“ اس نے بگڑ کر کہا اور اس کی آنکھوں میں

آنسو آگئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

”پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں ضرور رہی ہو؟ ہم لوگ تو بے چارے
گوتم کو ایسا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ نہ راکھش نہ دیوتا۔ تم نے اس چکر میں چاہے بھی
ٹھنڈی کر دی۔ اے لومصالحہ جلا جا رہا ہے۔ بھن گیا مصالحہ لے اب گوشت ڈال
دوبلی طلعت۔“

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں۔ یہ نرگیش کافلیٹ تھا اور سر
یکھا پھولوں میں کھڑی بال سکھا رہی تھی اور شاننا صوفے پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔
چہرے وہی تھے ماسک نئے تھے۔

”گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے۔“ شاننا نے باواز بلند پوچھا۔

کیا؟ وہ چونکی

میرا مطلب ہے، ”شاننا نے سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا گویا چمپا
ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی۔“
وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لائبریری کے بک شیلف پر واپس رکھ دیا گیا۔
”پتا نہیں۔“

”تمہاری ممبر شپ کی میعاد ختم ہو چکی؟“

شاننا کریگ علاوہ مغرور ہونے کے، کمینہ بھی تھی۔

”یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔“

شاننا اداسی سے مسکرائی۔ اس کا پرغور تبسم اس کا انداز اس کا طرز
لباس۔۔۔ چپا کس دھیان سے ان دنوں اس کی تقلید میں مصروف تھی۔

خوبصورت، کامیاب، ہرلعزیز، کریومن۔ وہ بھی شاننا ٹیلبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شاننا نے اطمینان سے اسے دیکھا: ”میں اس کے الوٹن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے۔“

”واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔“ چمپا نے طنز سے کہا۔

”تمہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ تم خود اپنے تصورات میں ضرورت سے زیادہ بتانا ہو۔ آدمی قربانی چاہتے ہیں بغیر اپنی قربانی دیئے۔ تم ان کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم پیرس سے یہاں کیوں آگئیں؟ اپنا اکیڈمک سال اٹھورا چھوڑ کر؟ اس لیے کہ وہ یہاں ہے۔“

”حکومت۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ چمپا کو بے حد غصہ آیا۔ اب وہ اپنی مزید توہین نہیں کروائے گی۔

”لیکن یہ جنگلی بلیخ کا تعاقب ہے،“ شاننا اپنی سریلی آواز میں کہتی رہی۔ (وہ احمد آباد اور بمبئی سے مرہٹی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتی تھی)۔

”تم افسانہ نگار ہونا اسی لیے میرے متعلق تم نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔“

”اب بل تم کو بلڈ اپ کرنا چاہتا ہے۔“ شاننا نے اپنی سریلی آواز میں بات ختم کی اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔

تہینہ رضا تر ملا سر بواستوا، شاننا کریگ۔

”چھا، یہ بات ہے۔“ چمپا نے اپنا کوٹ اور دستاں اٹھائے۔ ”میں قابل

نفرت ہوں۔ میں قابل نفرت ہوں۔ اچھا بھئی اب چلا جائے۔
نزگیش_____سریکھا_____شاننا_____خدا حافظ۔“

”کل دفتر آؤ تو وہ نیلی اون لیتی آنا جو ہم لوگوں نے اس دکان پر دیکھی تھی۔“
”شاننا نے اسی اطمینان سے کہا۔

”میں شاید کل دفتر نہ آؤں۔“ دروازے تک پہنچ کر اس نے دوبارہ پلٹ کر
کہا۔ ”کل کیا معنی؟ میں شاید کبھی تمہارے دفتر نہ آؤں۔ زشب بخیر۔“
باہر چیلسی کی سڑک پر آ کر اس نے دیکھا مکانوں کے درتے بپے بارش کے
سہانے دھند لکے میں چھپ گئے تھے۔ ٹکڑ کی بوڑھی عورت، جو پھول بیچتی تھی، بارش
سے بچنے کے لیے برساتی اوڑھے، کرسی پر دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی جانے کیا
سوچ رہی تھی۔ درپچوں میں سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچی جو
بہت دور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں اسے سرل کا خط ملا۔ اس نے
لکھا تھا: ”نیوہم میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آرہی ہو۔ یہ گرمیوں
کے چند مہینے کسی اداس اور رو میٹک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گزراؤ۔ میں شمال
جا رہا۔ روزماری بیمار ہے۔“

روزماری؟؟

کوہ نور کی ایک میز پر، جو درتے کے پاس بچھی تھی، گوتم، نرملا کے مقابل

بیٹھا ہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتا رہا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں آ آ کر بیٹھ رہی تھیں یا اٹھ اٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔ کمال معاف کرنا، کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لیے ایک دوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش و خروش سے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماؤ اور پیپلز چائنا کا نام دہرایا جا رہا تھا۔ گوتم نے اس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔

”کمال کتنا پیارا لڑکا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ کم سن بھیا کے ہونے سے مجھے یہی لگتا ہے کہ بھین یہاں موجود ہیں۔ اگر کم سن بھیا اور طلعت نہ آ رہے ہوتے تو اماں مجھے ہرگز اکیلا ولایت نہ بھیجتیں۔“ ترملانے کہا۔

”تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سن کر بڑا دکھ ہوا۔“ گوتم نے کہا۔ وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ترملانے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔ چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

”تم سب نے ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ ہم نے ان کو برا بر غلط سمجھا ہے۔“ مثال کے طور پر۔“ اس نے ذرا جوش سے دہرایا اور کانٹا اٹھا کر ترملانے کو سمجھانا شروع کیا، ”انہوں نے کبھی بھیا صاحب کو اپنی سے، یعنی کہ چھیننا نہیں چاہا تھا۔“

”بہر حال، میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔“ ترملانے کہا اور مصروف نظر آنے کے لیے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

”تمہارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپن سے جانتے ہیں۔“

”یہ بچپن سے جاننے کی دھونس اچھی ہے!“ گوتم نے کہا۔ ”تمہارے یہاں بہر سے بچپن کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمپا احمد کو بچپن سے نہیں جانتے، وہ گدھے ہیں؟“

اب گوتم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی لیکس دیکھو کیا ہوا کہ گوتم نے ہاتھ بڑھا کر دفعتاً سوچ بند کر دیا۔

گوتم: انسانی کردار کا بے رحم نفاذ ویدانت کا گرو، چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے۔ بھگوان تیری لیا انیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا:

”نزل۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب! میں بہت پھٹپھڑ ہوں، تم نے ٹھیک کہا، مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”نعم البدل؟ نہیں، سوری گوتم۔“

”نزل۔۔۔۔۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ او نزل۔۔۔۔۔“ اب وہ پھر اندھیرے میں چلا گیا۔ وہ بہت قابل رحم تھا۔ اسکول کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے مرد سمجھ دار ہوتے ہیں۔ ارے ان سے زیادہ مورکھ کون ہوگا۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرملہ کو احساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح، درختوں کی طرح، بیرو میٹر کے پارے کی طرح اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گیان ارباہیہ۔ اب مصنوعی روشنیاً بجھا کروہ بھی اس اندھیرے میں چلی جائے

